نیا
اُردو نصاب

اِنتخاب نثر و نظم

مطابق سلیبس مقررّہ

جمّوں و کشمیر بورڈ آف سکول ایجوکیشن

گیارھویں جماعت کے لئے

کپور برادرس بکسیلرز و پبلشرز لال چوک سرینگر



1. منشی پریم چند
2. پروفیسر آل احمد سرور
3. مرزا فرحت اللہ بیگ
4. ڈاکٹر ذاکر حسین
5. پطرس بخاری

اردو نصاب

حالاتِ زندگی

---

1. میر تقی میر
2. خواجہ معین الدین چشتی
3. مرزا اسد اللہ بیگ
4. الطاف حسین حالی

---

(۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ مثنوی بیت

نیا

اُردو نصاب

اِنتخاب نثر و نظم

مطابق سلیبس مقررہ

جموّں و کشمیر بورڈ آف سکول ایجوکیشن

گیارھویں جماعت کے لئے

کپور برادرس بک سیلرز و پبلشرز لال چوک سری نگر

قیمت نو روپئے پچاس پیسے

پڑھئے اور ضرور پڑھئے

کپور مکمل اُردو گائیڈ

مصنفہ

جناب ایس ایل گومر گولڈ میڈلسٹ

جماعت گیارھویں کے مکمل اُردو سلیبس کے عین مطابق

پاپولر انگلش گائیڈ

مصنفہ کے راجا رام

فہرست مضامین

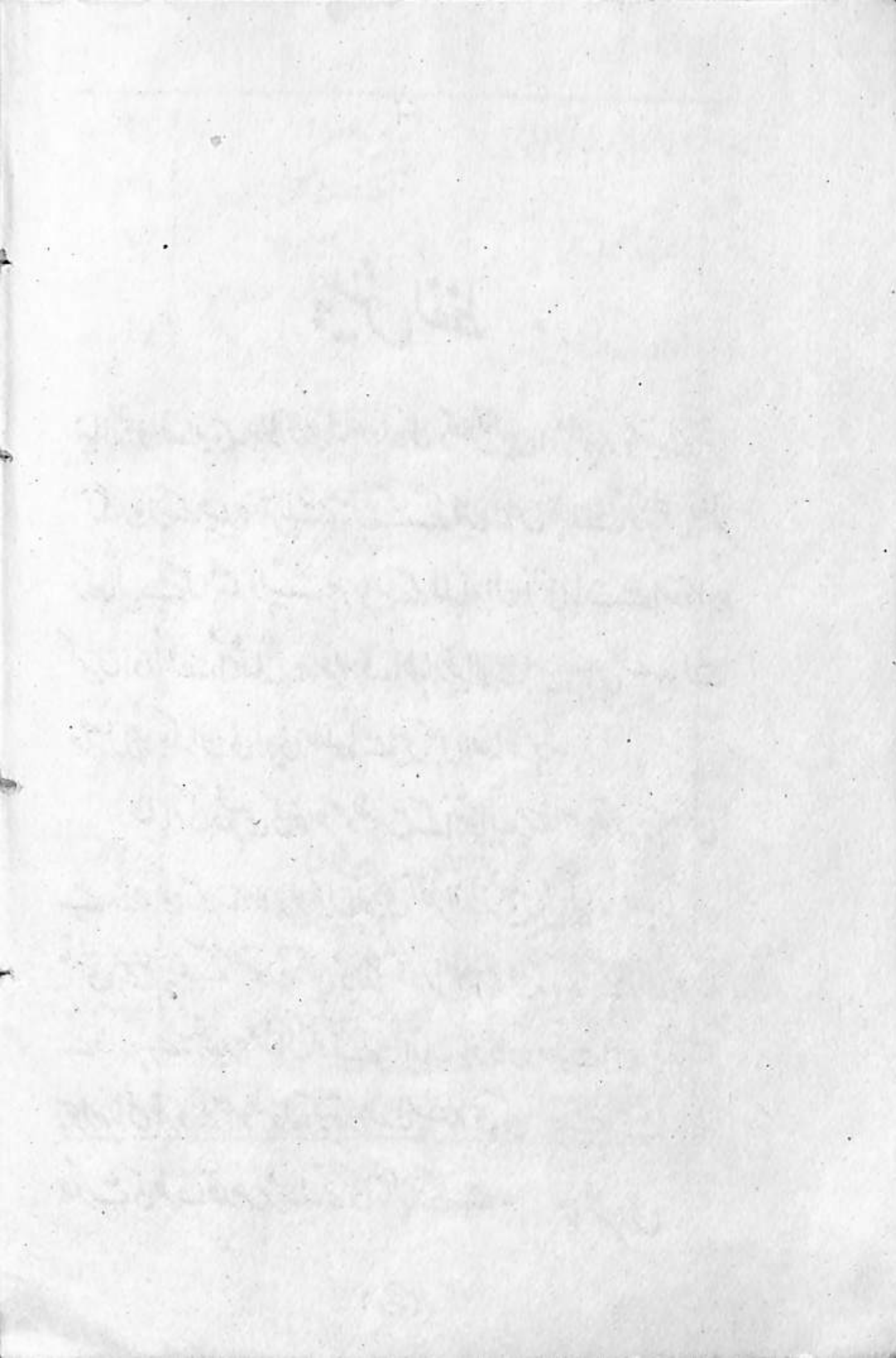
حصۂ نثر

حصۂ نظم

پیش لفظ

نیا اردو نصاب میں عالی درجہ شاعروں کی دلکش نظمیں اور مشہور و مقبول نثر نگاروں کے چیدہ نثر پارے پیش کئے گئے ہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ بلند و پست ہر پایہ کے طلباء ان انتخابات سے استفادہ کریں اور لطف اٹھائیں۔ نہ صرف اظہار خیالات میں انہیں سہولت حاصل ہو بلکہ ان کی ادبی معلومات میں بھی اضافہ ہو۔

طلباء کی دلچسپی کی خاطر موضوع کے انتخاب پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ زندگی کے سادہ پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ منشی پریم چند کے مضمون "گلی ڈنڈا" اور اطہر پرویز کے "محلے کی ہولی" سے ظاہر ہے۔ سنجیدہ مثال کو لیجئے: "ایک یادگار وصیت" میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ہم وطنوں کو قدامت پسندی کی راہ سے ہٹنے اور جدّت کی طرف قدم بڑھانے کی تاکید کی ہے۔ ناشران



حصّۂ نثر

منشی پریم چند

آپ کا اصلی نام دھنپت رائے اور علمی دنیا میں پریم چند کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع بنارس کے موضع پانڈے پور میں پیدا ہوئے ان کی تعلیم گھر پر اُردو فارسی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ والد کا انتقال ہونے کے بعد گھر کا سارا بار ان ہی کے سر پر پڑ گیا۔ مجبوراً محکمۂ تعلیم میں ملازمت کر لی۔ لیکن نجی طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ اور کچھ عرصہ بعد بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ دوران ملازمت میں ادبی مشاغل سے دلچسپی لینے لگے۔ لیکن ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا۔ ناول۔ افسانے۔ ڈرامے لکھنے اور شائع کرانے لگے۔ ترک موالات کی تحریک پر سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ اور ہمہ تن ادبی مشاغل میں منہمک ہو گئے۔

طرزِ تحریر پریم چند افسانہ نگاروں میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ سب سے پہلے اہلِ قلم ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔ ان کے افسانے جنوں اور پریوں کے فرضی قصّے نہیں۔ بلکہ روزمرّہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے سچّے واقعات ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے فطری جذبات سانس لیتے اور کروٹیں بدلتے ہیں۔

پریم چند جہالت۔ غربت۔ رسم و رواج، دولت کی غلط تقسیم مذہب کے نام پر انسانیت کا خون اور ایسی ہی تمام باتوں کے خلاف تادم آخر قلمی جہاد کرتے رہے۔

پریم چند کا طرزِ تحریر شبلی اور آزاد کے طرز کے بین بین ہے۔ چھوٹے چھوٹے شیریں فقرے نہایت صاف سلیس اور رواں پھر اسی سادگی میں جوش پیدا کرنا صرف انہی کا حصّہ ہے۔

زادِ راہ۔ پریم پنیسی، میدان عمل، پردۂ مجاز، گئودان۔ بیوہ، بازارِ حُسن، فردوسِ خیال، آخری تحفہ اور خاک پروانہ وغیرہ کتابیں محض اوقات گذاری کے لئے نہیں بلکہ کسبِ فیض کے لئے ہمیشہ پڑھی جائیں گی۔ انسانیت انہیں کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ وہ بہت غیر متعصب شخص تھے۔ اور ان کے مزاج میں رواداری بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔

پریم چند کی تحریر میں سادگی۔ تڑپ۔ اثر۔ خلوص جذبہ۔ اور سچی بات کے بے مثل مرقعے ملتے ہیں۔ آپ کی عبارت آہستہ آہستہ دل پر اپنا سکّہ جماتی ہے۔ ہندی، اُردو کے سنگم نے آپ کی زبان کو خوب صورت اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ آپ کی تحریریں دیہات کی رنگین شام۔ انوکھا سویرا اور جُھلسا دینے والی دوپہر کی دھوپ ملتی ہے۔ کھیتوں کے لہلہاتے منظر اور اس پر ہوا کے تیز جھونکے۔ پکی ہوئی کھیتی، ہرے بھرے درخت سب کچھ موجود ہیں۔ پریم چند بڑے محبِّ وطن ہیں۔ وہ ہندوستان کی ہر چیز کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ آپ ہندوستان کی قدیم تہذیب کی قدر اور احترام کرتے ہیں۔ آپ کی کہانیوں کے پلاٹ بہت اچھوتے ہیں زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہوتی ہے۔

منشی پریم چند

منشی پریم چند

گلی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں، میں تو یہی کہوں گا کہ گلی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجا ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ جاکر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے نہ شنگارڈ، نہ نیٹ کی، نہ بیلے کی۔ مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی۔ گلی بنالی۔ اور دو آدمی بھی آگئے تو کھیل شروع ہوگیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ جب تک کم از کم ایک روپیہ خرچ نہ کیجئے، کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے رنگ چوکھا دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہوگئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیل

کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندوستانی کھیل کھلائیں جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں۔ انگریزی کھیل ان کے لئے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے۔ بے چارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول ترچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہے گلی سے آنکھ پھوٹنے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے کا، تلی پھٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا؟ اگر ہمارے ماتھے پر گلی کا داغ آج تک لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی دوست ایسے بھی ہیں جو بلّے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکٹ بھی رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلی ڈنڈا ہی سب سے شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصباح گھر سے نکل جانا۔ وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلی ڈنڈا بنانا۔ وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی جھگڑے، وہ بے تکلّف سادگی جس میں چھوت اچھوت اور غریب امیر کی کوئی تمیز نہ تھی جس میں امیرانہ چونچلوں کے غرور اور خودنمائی کی گنجایش ہی نہ تھی۔ اسی وقت کھوئے گا جب گھر والے بگڑ رہے ہیں۔ والد صاحب چوکے پر بیٹھے ہوئے روٹیوں پر اپنا غصّہ اتار رہے ہیں۔ امّاں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے۔ لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے۔ اور میں ہوں کہ پدانے میں

مست ہوں۔ نہ نہلانے کا خیال ہے نہ کھانے کا گلّی ہے تو ذرا سی لیکن اس میں دنیا بھر کی مٹھاس اور عاشقوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہمجولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دُبلا، لمبا، بندروں کی سی پُھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ۔ گلّی کیسی ہی ہو اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا پر تھا ہمارا گلّی کلب کا چمپین۔ جس کی طرف وہ آجائے اس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اسے دُور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دونوں ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا اور میں پد رہا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں۔ پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لئے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے موقعہ پر خلاف قانون ہوتے ہوئے بھی قابل معافی ہیں۔ لیکن گیا اپنا داؤں لئے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا۔ منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا میرا داؤں دے جاؤ، پدا پدا کر تو بڑے بہادر بن کر، پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟

"تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں گا۔"؟

"ہاں! تمھیں دن بھر پدنا پڑے گا۔"
"کھانے جاؤں نہ پینے؟"
"ہاں میرا داؤں دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے"
"میں تمھارا غلام ہوں؟"
"ہاں تم میرے غلام ہو"
"میں گھر جاتا ہوں، دیکھوں تم میرا کیا کر لوگے"
"گھر جاؤ گے کیسے دل لگی ہے۔ داؤں دیا ہے داؤں لے لیں گے۔"
"اچھا کل میں نے تمھیں امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو۔"
"وہ تو پیٹ میں چلا گیا"
"نکالو پیٹ سے، تم نے کیوں کھایا میرا امرود"؟
"امرود تم نے دیا تب میں نے کھایا۔ میں تم سے مانگنے گیا تھا؟"
"جب تک میرا امرود نہ دو گے میں، داؤں نہ دوں گا۔"
میں سمجھتا تھا کہ انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لئے ہی اسے امرود کھلایا ہو گا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض ہی کے لئے دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصل ہے؟
رشوت دے کر تو لوگ خون چھپا جاتے ہیں۔ وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا؟ امرود پیسہ کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی تھی۔
گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔"میرا داؤں دے کر

جاؤ۔ امرود سمرود میں نہیں جانتا۔"
مجھے انصاف کا زور تھا۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔ میں نے گالی دی۔
اس نے اس سے بھی سخت گالی دی۔ اور گالی ہی نہیں چانٹا جما دیا۔ میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا۔ اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔
گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بھاگا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر پہنچا۔ میں تھانہ دار کا لڑکا۔ ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا۔ لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔
ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہمجولیوں سے جدا ہونے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں بھی بہت افسوس کرتی تھیں، یہاں سب چیزیں سستی تھیں اور محلّے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھار رہا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی اسکولوں میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔ میرے

دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہوں میں کتنا اونچا اُٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم جو سچے کو جھوٹا بنا دیتے ہیں نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے تم خوش قسمت ہو بھائی جاؤ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے۔

بیس سال گذر گئے میں نے انجینری پاس کی اور کسی ضلعے کا دورہ کرتے ہوئے اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی بچپن کی الف لیلیٰ درد ان گنت اور شیریں یاد تازہ ہو اُٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبہ کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں جن کے ساتھ ہی کتنی یادگاریں وابستہ تھیں۔ لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھا وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا ایک پرانا درخت تھا وہاں اب ایک خوب صورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ اگر اس کے نام ونشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لئے بے

قرار ہو رہی تھیں مگر وہ دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں کہ تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمھاری یاد تازہ ہے۔ اچانک ایک کھلی جگہ میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا ایک لمحہ کے لئے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں، صاحبی ٹھاٹھ ہیں۔ رعب اور اختیار کے لباس میں ہوں۔ جا کر ایک لڑکے سے پوچھا "کیوں بیٹے۔ یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟"

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا "کون گیا۔ گیا چمار؟ ہاں ہے تو۔"

میں نے یونہی کہا "ہاں ہاں وہی۔ گیا نام کا ایک آدمی ہے تو شاید وہی ہو۔ اسے بلا سکتے ہو؟"

لڑکا دوڑا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لئے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا "کہو کیا مجھے پہچانتے ہو؟"

گیا نے جھک کر سلام کیا "ہاں مالک بھلا پہچانوں گا کیوں نہیں آپ مزے میں رہے؟"

"بہت مزے میں تم اپنی کہو۔"

"ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں"
"ماتا دین، درگا۔ دونوں ڈاکئے ہو گئے ہیں۔ اور آپ؟"
"میں ضلع کا انجینیر ہوں"
"سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین (ذہین) تھے"
"اب بھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟"
میں نے گیا کی طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔
"گلی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار! اب تو پیٹ کے دھندے ہی سے چھٹی نہیں ملتی۔"
"آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا ہم پدیں گے۔ تمہارا ایک داؤں ہمارے اوپر ہے وہ آج لے لو۔"
گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ وہ ٹھیکے کا مزدور میں ایک بڑا آفیسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ۔ بے چارہ جھینپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کچھ کم جھینپ نہ تھی۔ اس لئے نہیں کہ میں گیا کے ساتھ کھیلنے جا رہا تھا بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشہ بنالیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دور تنہائی میں جا کر کھیلیں۔ وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی مٹھائی کو خوب مزے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا اور موٹر میں

بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے اور ساتھ ہی ایک کلہاڑی لے لی۔
میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ
رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا شاید
ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔ میں
نے پوچھا۔

"تمہیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا"

گیا جھینپتا ہوا بولا "میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور! کس لائق
ہوں۔ قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا، نہیں تو
میری کیا گنتی؟"

میں نے کچھ اُداس ہو کر کہا "لیکن مجھے تو تمہاری یاد برابر آتی
تھی۔ تمہارا وہ ڈنڈا جو تان کر جمایا تھا یاد ہے نا؟"

گیا نے شرماتے ہوئے کہا "وہ لڑکپن تھا سرکار! اس کی یاد
نہ دلاؤ۔"

"واہ! وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمہارے
اس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب نہ عزت اور بڑائی میں پاتا
ہوں نہ دولت میں۔ کچھ ایسی مٹھاس تھی اس میں کہ آج تک اس
سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے۔"

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں
طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا

جہاں آکر ہم کسی وقت کنول کے پھول توڑتے جاتے تھے۔ اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے، جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آرہی تھی۔ میں لپک کر درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا۔ جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا میں نے راب میں گلّی رکھ کر اچھالی اور گلّی گیا کے سامنے سے نکل گئی۔

اس نے ہاتھ لپکا، جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلّی اس کے پیچھے جا کر گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلّی آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ داہنے بائیں ہو گلّی اس کی ہتھیلی میں پہنچتی تھی جیسے گلّیوں پر اس نے جادو کر کے انھیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلّی، پرانی گلّی، چھوٹی گلّی، بڑی گلّی، نوک دار گلّی سب ہی اس سے ہل جاتی تھیں۔ گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت تھی جو گلّیوں کو کھینچ لیتی ہے لیکن آج گلّی کو اس سے وہ محبّت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ داؤں پورا ہونے پر ڈنڈا کھیلے جاتا تھا۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہئے تھی۔ گلّی پر جب ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دور گر پڑتی تو لپک کر اسے خود ہی اٹھا لاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ نہ بولتا تھا گویا اسے تمام قاعدے قوانین بھول گئے ہوں۔ اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا گلّی اس سے نکل کر ٹن سے

ڈنڈے پر آکر لگتی تھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا۔ لیکن آج وہ گلی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں ہے۔ کبھی داہنے جاتی ہے کبھی بائیں۔ کبھی آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد گلی ایک بار ڈنڈے میں آلگی۔ میں نے دھاندلی کی، گلی ڈنڈے میں نہیں لگی بالکل پاس سے گئی لیکن لگی نہیں۔

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا" نہ لگی ہوگی"۔

"ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا؟"

"نہیں بھیا تم بھلا بے ایمانی کروگے"۔

بچپن میں مجال تھی میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکا دیئے چلا جاتا تھا گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا۔

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا لیکن کیوں نہ ایک بار جھوٹ بنانے کی کوشش کروں میرا حرج ہی کیا ہے۔ مان گیا تو واہ واہ" ورنہ دو چار ہاتھ تو پدنا ہی پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑالوں گا پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔ گیا نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"لگ گئی ٹن سے بولی"

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے لگتے دیکھا۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"ٹن سے بولی ہے سرکار۔"

"اور جو کسی اینٹ سے لگ گئی ہو"

میرے منہ سے یہ فقرہ کیسے نکل گیا اس پر مجھے تو حیرت ہے۔ اس سچّائی کو جھٹلانا ویسا ہی تھا جیسے دن کو رات کہنا۔ ہم دونوں نے گلی کو ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

"ہاں سرکار کسی اینٹ میں لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی۔"

میں نے پھر پدانا شروع کیا۔ لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لئے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی۔ تو میں نے بڑی فراخ دلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا "اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیّا۔ کل پر رکھو۔"

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہوگا یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لئے اس وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہوگا" نہیں نہیں۔ بہت اُجالا ہے تم اپنا داؤں لے لو۔"

"گلی سوجھے گی نہیں۔"

"کچھ پروا نہیں۔"

گیا نے پدانا شروع کیا۔ لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی۔ اس نے دوبارہ ٹل لگانے کا ارادہ کیا۔ لیکن دونوں ہی بار وہ چوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا۔ بے چارہ گھنٹہ بھر پدا لیکن ایک منٹ میں اپنا داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا "ایک داؤں اور لے لو۔ تم پہلے ہی ہاتھ میں ہار گئے"۔

"نہیں بھیّا! اب اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"تمہاری مشق چھوٹ گئی؟ کبھی کھیلتے نہیں ہو"

"کھیلنے کا وقت ہی نہیں ملتا بھیّا۔"

ہم دونوں موٹر میں جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ گیا چلتے چلتے بولا "کل یہاں گلی ڈنڈا ہو گا۔ سبھی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے۔ تم بھی آؤ گے جب تمہیں فرصت ہو۔ سب ہی کھلاڑیوں کو بلا لوں گا"۔

میں نے شام کا وقت دیا۔ اور دوسرے دن میچ دیکھنے کو گیا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔ مگر بیشتر نوجوان تھے جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا میں موٹر پر بیٹھا بیٹھا تماشہ دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ٹل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی سی وہ جھجک، وہ ہچکچاہٹ، وہ بیدلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے

کمال کی معراج تک پہنچادی تھی۔ کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا۔ اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔ ۵

پدنے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا کہ لگ کر اُچھلی ہے اس پر دونوں میں تال ٹھوکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آرہا تھا جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ کل گیا میرے ساتھ کھیلا نہیں، کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اس نے مجھے رحم کے قابل سمجھا۔ میں نے دھاندلی کی۔ بے ایمانیاں کیں۔ اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا اس لئے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا۔ میرا جی دیکھ رہا تھا۔ وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اب افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔ میں اب اس کا لحاظ پا سکتا ہوں ادب پا سکتا ہوں۔ لیکن اس کا ہمجولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا۔ تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں اور اب وہ مجھے اپنا جوڑا نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا ہو گیا ہے میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

حالاتِ زندگی مرزا صاحب ۱۸۸۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بدخشاں سے آئے تھے۔ اور اکبر شاہ ثانی کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں "مختارِ کل" کی حیثیت سے مقرر تھے۔ فرحت اللہ کی ابتدائی تعلیم دہلی کے گورنمنٹ اسکول میں ہوئی۔ اور سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اوّل اوّل تو سررشتۂ تعلیم میں کام کیا۔ پھر سررشتۂ عدالت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ آخر میں اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کا عہدہ سنبھالا۔ حیدر آباد کی ادبی صحبتوں نے مرزا صاحب کے فطری ادبی ذوق کو ابھارا۔ اور آپ کا شوخ قلم مزاح نگاری کے میدان میں اپنی جولانیاں دکھانے لگا۔ آپ نے دیوان یقینؔ مرتب کیا۔ اور اس پر ایک زبردست تحقیقی مقدمہ لکھا۔ دیوان نذیر کا مقدمہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ محقق سے زیادہ مزاحیہ مضامین کے بادشاہ ہیں۔ نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی۔ آخری وصیت، نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر۔ دادا جان کا پارلیمنٹ میں جانا۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ۔ پھول والوں کی سیر ایسے مضامین ہیں جو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ ۱۹۴۶ء میں آپ حیدر آباد میں انتقال فرما گئے۔

طرزِ تحریر مرزا صاحب کا طرزِ تحریر سادہ اور پُرلطف ہے۔ سنجیدہ ظرافت اتنی رسیلی زبان میں ادا ہوتی ہے کہ پڑھنے والا

اس کے مرنے کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے مضامین میں شوخی، دلی کی ٹکسالی زبان۔ چستیِ الفاظ۔ دل کش انداز بیان، اس پر سوئے پر سہاگہ۔ لطیف ظرافت کی رنگ آمیزی گویا آسمان ادب پر دلفریب شفق چھائی ہے۔ مرزا صاحب کے پانچ مجموعے، مضامینِ فرحت اللہ بیگ کے نام سے اب تک بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔

فرحت اللہ کی تحریریں شوخیٔ طبیعت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بیان پر انہیں زبردست قدرت حاصل ہے وہ تفصیل میں بھی حسنِ بیان اور انشا کی لطافت پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں۔ اور بڑے فراخ اور ظرافت کے پہلو نکالتے جاتے ہیں۔ زبان پر فرحت اللہ بیگ کو بلا کی قدرت حاصل ہے۔ وہ محاورات کو بڑی مشاقی اور لطافت کے ساتھ اپنی تحریروں میں کھپاتے ہیں۔ فرحت اللہ الفاظ کی دل کشی، بیان کی روانی اور لطیف شگفتہ نگاری سے ایک عالم پیدا کر دیتے ہیں جس میں طبیعت کو حقیقی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ان کا مشہور مضمون "دہلی کا ایک ادبی یادگار مشاعرہ" جو اب کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اُردو ادب میں اپنے طرز کی بہت بلند پایہ چیز ہے۔ اس میں دہی مرحوم کے ہم عصر شاعروں کی معاشرت، انداز حیثیت، مشاعروں کے آداب غرض دہلی کی ادبی زندگی کی بہت جان دار روشن اور فکر انگیز تصویر ملتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

ایک کہانی

گرمی کا موسم ہے چاندنی رات ہے۔ صحن میں پلنگ بچھے ہیں۔ کھانا وانا کھا کر سب ابھی لیٹے ہیں۔ ایک پلنگ پر دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ کھسر پُسر کر رہی ہیں۔ دوسرے پلنگ پر ان کے دو چھوٹے چھوٹے بھائیوں احمد اور محمود میں کُشتم کُشتا ہو رہی ہے۔ اُن کی والدہ تخت پر جا نماز بچھائے عشاء کی نماز پڑھ رہی ہیں، اُن کی نانی نے ابھی نماز سے فارغ ہو کر پاندان کھولا ہے۔ پاندان کی آواز سنتے ہی احمد اور محمود لڑائی وڑائی چھوڑ کر پلنگ سے اٹھے اور نانی سے آکر لپٹ گئے۔ احمد نے کہا "نانی اماں کہانی" محمود نے کہا "نانی اماں کہانی" یہ سننا تھا کہ سعیدہ اور حمیدہ بھی اُٹھ بیٹھیں اور انھوں نے بھی نانی سے کہانی کا تقاضا کیا۔ بڑی بی بہت کچھ کہتی رہیں "ارے بھائی! میرے سر میں درد ہے۔ کل کہوں گی دیکھو غل نہ مچاؤ۔ تمہاری اماں کی نماز میں ہرج ہوتا ہے۔" مگر کون سنتا تھا۔ آخر گھسیٹ گھساٹ

بڑی بی کو پلنگ پر لا بٹھایا۔ دو ایک پہلو میں لیٹ گئے اور دو دوسرے پہلو میں اور اب بحث شروع ہو گئی کہ کون سی کہانی کہی جائے۔ میاں احمد سب سے چھوٹے تھے ان کا اصرار تھا کہ تو تا مینا کی کہانی کہو۔ لڑکیاں سر تھیں کہ ڈلّا کا قصہ سناؤ۔ بڑی بی پریشان تھیں کہ کون سی کہوں اور کون سی نہ کہوں۔ آخر کہنے لگیں "تم سوچنے تو دیتے نہیں کہوں تو خاک کہوں۔ اور ذرا دم لو میں سوچ تو لوں"۔ یہ سن کر بچے چپ ہو گئے بڑی بی نے دماغ پر ذرا زور ڈال کر اس طرح کہنا شروع کیا:

"تو ہاں بھئی خدا تمہارا بھلا کرے۔ ایک تھی بڑھیا، بیچاری کے ایک ہی بچہ تھا۔ مصیبت کی ماری سارے دن سُوت کاتتی، شام کو گدڑی میں جا کر بیچ آتی۔ بنیا بنئے کے ہاں"

سعیدہ۔ نانی اماں وہی بنیا جس کے ہاں سے ہمارا اناج آتا ہے۔

احمد۔ نانی اماں بنیا پودینا باجرے کی روٹی ٹکا جھینا۔

بڑی بی نے بچوں کو ڈانٹا کہ نہ تم سنتے ہو نہ کہنے دیتے ہو۔ چلو جاؤ اپنی اماں سے جا کر کہانی سنو۔ وہ نماز پڑھ چکی ہیں۔ مجھ سے سننا ہو تو چپکے لیٹے رہو۔

خیر پھر اقرار ہوئے اور بڑی بی نے کہا "تو ہاں میں نے کہاں تک کہا تھا"؟

حمیدہ۔ دینا بنئے کے ہاں سے۔

بڑی بی ہاں بنئے کے ہاں سے۔ تھوڑی سی دال، تھوڑا سا آٹا، تھوڑا سا نمک، مرچ لاتی، پکاتی۔ خود کھاتی بچے کو کھلاتی۔ اسی طرح کئی برس گذر گئے۔ بچہ خاصا سیانا ہو گیا۔

احمد۔ نانی اماں سیانا کیا؟

نانی۔ یعنی زرا بڑا، ہشیار۔

میاں محمود جوش میں آکر اٹھ بیٹھے اور کہا۔ نانی اماں جیسے میں۔ بہنوں نے میاں محمود کو پکڑ دھکڑ کر زبردستی لٹا دیا اور پھر کہانی شروع ہوئی۔

نانی۔ جب ذرا سیانا ہوا تو میاں جی کے پاس پڑھنے بٹھایا۔

احمد۔ نانی جی تختی پہ تختی میاں جی کی آئی کم بختی۔

نانی۔ نا بٹیا۔ ایسی بری باتیں نہیں کیا کرتے۔ مولوی صاحب باپ کے برابر ہوتے ہیں۔ احمد کو بھائی بہنوں نے زبردستی خاموش کیا اور کہانی کا پھر سلسلہ چھڑا۔

نانی۔ بھئی وہ لڑکا ایسا نکلا، ایسا نکلا کہ سبحان اللہ۔ تھوڑے دنوں میں پڑھ پڑھا خاصا مولوی ہو گیا۔ اب بڑی بی کے دن پھرے۔ اچھے اچھے کھانے پکاتیں۔ اچھے اچھے کپڑے بناتیں مزے سے دونوں ماں بیٹے رہتے۔ جب ہوتے ہوتے

تھوڑا بہت روپیہ بھی جمع ہوگیا تو بڑی بی کو بچّے کی شادی کی سوجھی۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب بیاہ لائیں۔ بڑے چاؤ سے بہو کو گھر میں اُتارا۔ اچھے سے اچھا کھانا بہو کو کھلاتیں۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہناتیں۔ مگر بہو تھی کہ کوئی چیز اس کے بھاتوں ہی نہ تھی۔ جب تک گھونگھٹ رہا اس وقت تک کسی نہ کسی طرح گزرے گئی۔ گھونگھٹ اٹھنا تھا کہ ساس پر مصیبت آگئی۔ زبان سے ہوتے ہوتے ہاتھ پر اتر آئی۔ خود ہی بڑھیا کو مارتی اور خود ہی ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی۔ خاوند سے وہ وہ لگائی بجھائی کی کہ ایک دن بیٹے نے بھی خوب مارا۔ موئے کو بڑھیا پر ہاتھ اٹھاتے شرم بھی نہ آئی؟

نانی۔ ہاں بیٹا۔ اچھی بیٹیاں ساس کو ماں کے برابر سمجھتی ہیں۔ توبہ دور پار۔ اگر شریفوں کی بہو بیٹیاں ایسی باتیں کرنے لگیں تو پھر شریفوں اور چوہڑے چماروں میں کیا فرق رہ جائے؟ ہاں تو بیٹے نے مار پیٹ بڑھیا کو گھر سے نکال دیا۔

محمود۔ اور ہلدی چونا نہیں لگایا۔

نانی۔ ہلدی چونا لگانا ہوتا تو مارتا ہی کیوں؟ خیر بیچاری بڑھیا روتی رُلاتی جنگل بیابان میں جہاں آدم نہ آدم زاد ایک بڑ کے درخت کے نیچے جا بیٹھی اور لگی منہ ڈھانک ڈھانک

کے رونے۔ خدا کا کرنا کیا ہونا ہے کہ انھیں دنوں جاڑا گرمی
برسات میں جھگڑا ہوا۔ جاڑا کہتا تھا میں اچھا۔ گرمی کہتی تھی
کہ میں اچھی۔ برسات کہتی تھی کہ میں اچھی۔ آخر صلاح یہ ہوئی
کہ چلو چل کر کسی آدم زاد سے پوچھیں۔ ان کا جو ادھر گذر
ہوا تو تینوں نے کہا "لو کھئی وہ سامنے ایک بڑھیا بیٹھی
رو رہی ہے چلو اس سے پوچھیں"۔
سب سے پہلے میاں جاڑے آئے۔ گوری گوری رنگت۔
گلے ایسے جیسے انار کا دانہ، سفید لمبی داڑھی، موٹا سا روئی
کا دگلا پہنے۔
حمیدہ۔ نانی اماں وہ کہاوت کیا ہے۔ دگلا سب سے اگلا۔
نانی۔ دگلا سب سے اگلا، پہنوں تو گرم بچھاؤں تو نرم۔
یا نہ دھو تو بقچی کا بھرم۔ تو ہاں موٹا سا روئی کا دگلا پہنے خوب
اوڑھے لپٹے آئے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑی بی کو تھرتھری چھوٹ
گئی۔ میاں جاڑے نے آکر کہا۔ بڑی بی سلام۔ بڑی بی نے کہا،
"بیٹا جیتے رہو۔ بال بچے خوش رہیں۔ مگر بیٹا ذرا دھوپ چھوڑ کر
کھڑے ہو۔ مجھے تو تمہارے آنے سے کپکپی سی لگ رہی ہے۔ خیر
میاں جاڑے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوئے اور کہا کہ بڑی بی ایک
بات پوچھوں؟ بڑی بی نے کہا ہاں بیٹا ضرور پوچھو۔ میاں جاڑے
نے کہا "بڑی بی جاڑا کیسا؟"

بڑی بی نے کہا "بیٹیا جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ بھاوٹ برس رہی ہے۔ دالانوں کے پردے پڑے ہیں اور انگیٹھیاں سُلگ رہی ہیں۔ لحافوں میں دُبکے بیٹھے ہیں، چائیں بن رہی ہیں۔ خود پی رہے ہیں۔ دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ صبح ہوئی چنے والا آیا گرم گرم چنے لئے۔ پہلے پھوٹے پھوٹے چنے کھائے پھر کرڑ کرڑ ٹھڈّیاں چبا رہے ہیں۔ بچے ہیں کہ جیبوں میں چنے ڈالے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کابل سے طرح طرح کے میوے آرہے ہیں۔ سب مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔

سعیدہ۔ نانی اماں حلوا سوہن بنا رہا ہے۔

نانی۔ حلوا سوہن بنا رہا ہے۔ گاجر کی تری تیار ہو رہی ہے۔ باجرے کا ملیدہ بن رہا ہے۔ رس کی کھیر پک رہی ہے۔ اِدھر کھایا اُدھر ہضم اور خون ہے کہ چلو وں بڑھ رہا ہے۔ چہرے سُرخ سُرخ ہو رہے ہیں۔ بٹیا جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

میاں جاڑے تھے کہ اپنی تعریفیں سُن سُن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ جب بڑی بی چپکی ہوئیں تو میاں جاڑے نے کہا۔

"بڑی بی، خدا تم کو زندہ سلامت رکھے۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ یہ لو ایک ہزار اشرفی کی تھیلی۔ خرچ ہو جائے تو اگلے جاڑے میں مجھ سے آکر لے جانا۔"

میاں جاڑے ہٹے اور بی گرمی مٹکتی ہوئی سامنے آئیں کوئی

پندرہ سولہ برس کا سن، سرخ سرخ گال، ان پر ہلکا ہلکا پسینہ۔ روشن آنکھیں، لمبی کالی چوٹی، گلے میں موتیوں کا کنٹھا ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں جس میں کرن لگی ہوئی۔ ہرے ڈورے کی پیازی اوڑھنی، غرض بڑے ٹھسے سے آئیں، اور آتے ہی کہا۔ "نانی اماں جان! سلام" بڑی بی نے کہا "بیٹی جیتی رہو۔ بوڑھ سہاگن ہو۔ کہو تم بھی کچھ پوچھنے آئی ہو ابھی تمہارے بڑے ابا تو آکر پوچھ گئے ہیں۔"

بی گرمی نے کہا "نانی جان، وہ میرے بڑے ابا نہیں۔ وہ بڑے بھائی ہیں۔ ہاں تو پوچھنے آئی ہوں کہ نانی جان، گرمی کیسی؟"

بڑی بی نے کہا۔ بیٹا گرمی! گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ! دن کا وقت ہے۔ خس خانوں میں پڑے ہیں۔ پنکھے جھلے جا رہے ہیں بچوں کے ہاتھوں میں ہزارے ہیں ایک دوسرے پر چلا رہے ہیں۔ برف کی قفلیاں کھائی جا رہی ہیں۔ فصل کے میوے آ رہے ہیں۔ پتلی پتلی ککڑیاں ہیں، لوکاٹ ہیں۔ آڑو ہیں۔

حمیدہ۔ نانی اماں سیب ہیں۔ انگور ہیں۔

نانی۔ واہ بھئی واہ، انگور اور سیب جاڑے میں ہوتے ہیں، گرمی میں؟ تم جب بولتی ہو بے تکی بولتی ہو۔ ہاں تو شام کو اٹھے نہائے دھوئے، سفید سفید کپڑے پہنے خس کا عطر

ملا۔ گلے میں موتیوں کے کنٹھے ہیں، ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں ہیں، صحن میں چھڑکاؤ ہوگیا ہے۔ گھڑونچیوں پر کورے کورے مٹکے رکھے ہیں، قلعی دار بجریوں پر سوندھی صراحیاں جمی ہیں، گھڑوں اور صراحیوں کے منہ پر لال لال صافیاں لپٹی ہیں، اردگرد کاغذی آب خورے لگے ہوئے ہیں اور گلاب کی بسی گنڈیریاں کھا رہے ہیں۔ رات ہوئی کوٹھوں پر پلنگ بچھ گئے۔ سفید سفید چادریں بچھی ہیں۔ اوپر پھول پڑے ہیں۔ خس کی پنکھیاں ہاتھوں میں ہیں۔ کوئی بھیگے ہوئے باند کے کھرے پلنگ پر لوٹا پڑا ہے۔

احمد۔ نانی اماں کہانیاں ہو رہی ہیں۔

نانی۔ ہاں کہانیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ ہیں کہ رات کو فالیز پر جا رہے ہیں۔ خربوزے تربوز کھا رہے ہیں۔

محمود۔ ہاں کبڈی ہو رہی ہے۔

نانی۔ ہاں کبڈی ہو رہی ہے۔ ریتے میں لوٹ رہے ہیں صبح نہائے دھوئے مزے مزے گھر آگئے۔ بیٹا گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ، بی گرمی کا حال تھا کہ تعریفیں سنتی جاتی تھیں اور نہال ہوتی جاتی تھیں جب بڑی بی تعریفیں کرتے کرتے تھک کر چپ ہوگئیں تو بی گرمی نے چپکے سے نکال کر ایک ہزار اشرفی کی تھیلی ان کے ہاتھ میں دی اور کہا کہ " نانی جان خدا تمہارا

بھلا کرے۔ تم نے آج میری لاج رکھ لی ورنہ بڑے بھائی صاحب مارے طعنوں کے مجھے جینے بھی نہ دیتے، میں ہر سال آیا کرتی ہوں۔ جب آؤں جو لینا ہو مجھ سے بے کھٹکے لے لیا کیجئے بھلا آپ جیسے چاہنے والے مجھے ملتے کہاں ہیں؟"

بی گرمی ذرا ہٹی تھیں کہ برسات خانم چھم چھم کرتی پہنچیں۔ سانولا نمکین چہرہ، چمک دار روشن آنکھیں۔ کھورے بال۔ ان میں سے پانی کی باریک باریک بوندیں اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے موتی۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ جسم پر بادلہ ٹکا ہوا۔ آبی رنگ کا باریک دوپٹہ۔ غرض اُن کے آتے ہی برکھا رت چھا گئی، انھوں نے بڑھ کر کہا "اماں جان سلام۔ بڑی بی نے کہا "بیٹی جیتی رہو بیٹ ٹھنڈا رہے۔ ہو نہ ہو تم بھی گرمی کی بہن برسات خانم ہو"۔ بی برسات نے کہا۔"جی ہاں! میں بھی پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیسی ہوں"؟ بڑی بی نے کہا۔"بی برسات تمہارا کیا کہنا ہے تم نہ ہو تو لوگ جئیں کیسے! مینہ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں گھم گرٹے ہیں۔ ایک طرف کڑھائی چڑھی ہے۔ دوسری طرف بڑے پراٹھے پک رہے ہیں مرد ہیں کہ تیراکی کا میلہ دیکھنے گئے ہیں۔ لوگوں کے جمگھٹ ہیں۔ دریا چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی طرح تیر رہا ہے کوئی کسی طرح۔ اودی اودی گھٹائیں آئی ہوئی ہیں۔ پھوار پڑ رہی

ہے۔ نوروز ہو رہے ہیں۔ تالابوں میں آم پڑے ہیں۔ آم کھا رہے ہیں۔ گٹھلیاں چل رہی ہیں۔ برسات بھی برسات کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔"

بی برسات نے بھی ایک ہزار کی تھیلی بڑی بی کے نذر کی اور رخصت ہوئیں۔ شام ہو چلی تھی۔ بڑی بی تھیلیاں سمیٹ سماٹ خوشی خوشی گھر آگئیں۔ ان کی بہو نے دیکھا کہ بڑھیا بستر ابغل میں دبائے چلی آرہی ہے۔ آگ بگولہ ہو گئی۔ کہنے لگی "بڑھیا تو میرے گھر میں کیوں گھسی؟ کیا اپنا کفن لے کر آئی ہے؟ اب نکلتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں؟" بڑھیا نے کہا کہ "بیٹا! خفا کیوں ہوتی ہے؟ خالی ہاتھ تھوڑی آئی ہوں۔ تین ہزار اشرفی لائی ہوں۔ نکالتی ہے نکال دے میں اپنا الگ گھر لے کر رہ جاؤں گی۔" بہو نے جو پوٹلی دیکھی۔ اور تین ہزار اشرفی کا نام سنا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگی "اماں جان کیا سچ مچ تین ہزار اشرفی لائی ہو۔ میں بھی دیکھوں۔ تم صبح سے کہاں چلی گئی تھیں۔ آپ کا انتظار کرتے کرتے خدا جھوٹ نہ بلوائے دو تین بجے کھانا کھایا ہے۔ وہ بھی آپ ہی کو ڈھونڈنے گئے ہیں۔"

اتنے میں بیٹے صاحب بھی آگئے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بیوی نے آنکھ دے کر منع کر دیا۔ اب کیا تھا تھیلیاں کھولی گئیں۔ کئی کئی دفعہ اشرفیاں گنی گئیں۔ دو سو تو نکال

لیں باقی گڑھا کھود کر دبا دیں۔ اوپر بہو بیٹے نے اپنا بستر اکر دیا رات ہی کو نان بائی کے ہاں سے اچھا کھانا آیا۔ حلوائی کے ہاں سے اچھی اچھی مٹھائیاں آئیں۔ سب نے مزے مزے سے کھائی۔ صبح ہوئی تو بیٹے صاحب جا اپنے اور اپنی بیوی کے لئے اچھے سے اچھے تھان لائے۔ کپڑے سلنا شروع ہوئے بڑی بی کے پا جاموں کے واسطے آٹھ آنے والی چھینٹ، انگیا کرتی کے لئے چار آنے گز والی ململ، لال نری کی گول پنجے کی جوتی۔ سر میں ڈالنے کا دھوئی تلی کا تیل، کانوں کے لئے ملمع کی چار بالیاں۔ ہاتھوں کے لئے ڈیڑھ ماشے کے دو چھلّے، غرض بہت کچھ آیا۔ بہو اور بیٹا خوش تھے کہ بڑھیا قاروں کا خزانہ لے آئی۔ بڑھیا خوش تھی کہ بیٹے نے ماں تو سمجھا۔ چلو سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ بی ہمسائی نے جو یہ چہل پہل دیکھی تو ان سے نہ رہا گیا۔ ایک دن پوچھا "بہن ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہ مانو گی" بڑھیا کی بہو نے کہا "ہاں بہن شوق سے پوچھو۔ برا ماننے کی کون سی بات ہے" بی ہمسائی نے کہا۔ "بہن آخر ہم سے بھی کہو کہ یہ تمہاری ساس کہاں سے روپیہ مار لائیں۔ کہیں چرا نہ لائی ہوں۔ زمانہ برا ہے اگر چوری کا روپیہ نکلا تو بڑھیا کے ساتھ کہیں تم بھی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔ حق ہمسایہ ماں کا

جایا۔ ہم کہے دیتے ہیں آگے تم جانو اور تمہارا کام جانے۔"
بڑھیا کی بہو نے کہا "نا بہن کہیں یہ بڑھیا چوری کے قابل رہی ہے۔ اس کو تو یہ روپیہ گرمی جاڑے برسات نے دیا ہے"
ہمسائی نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا "اوئی بوا اپنے ہوش کی دوا کرو۔ بھلا جاڑا گرمی برسات کہیں روپیہ بانٹتے پھرتے ہیں۔ مجھے تم نے کیا دیوانہ سمجھا جو ایسی اُڑن گھائیاں بتاتی ہو۔ بتاؤ نہیں بتاتی ہو نہ بتاؤ۔ ہمارا کام سمجھانے کا تھا سمجھا دیا۔" بڑھیا کی بہو ڈری کہ بی ہمسائی اِدھر اُدھر کچھ نہ لگاتی پھریں۔ ساس پر جو گذری تھی پوری پوری سُنا دی۔ بی ہمسائی سنتی رہیں اور ہنستی رہیں۔ سب کچھ سنا۔ کھڑکی بند کر اپنے میاں کے پاس پہنچی اور ان کو سارا قصہ سنا دیا۔

بیٹے صاحب نے جو سُنا تو کہا لاؤ ہم بھی لگے ہاتھوں اپنی بڑھیا کے ذریعہ سے روپیہ سمیٹ لیں۔ ان کی بھی ایک اماں وہ بڑھیا کیا تھی آفت کی پڑیا تھی۔ گھر بھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ زرا بگڑی اور بہو کی سات پشت کو تول ڈالا۔ بہو کو آج موقع ملا۔ میاں کو سمجھا بجھا بڑھیا کی خوب کُندی کرائی اور ڈونڈا ڈولی کر جنگل میں اسی بڑ کے نیچے ڈال آئے۔ بڑھیا نے چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اٹھا لیا۔ خدا کا کرنا تھا جاڑا، گرمی، برسات، اسی دن پھر ملے۔ ایک نے

دوسرے سے کہا کہو" بھئی بڑھیا نے کیا تصفیہ کیا؟" جاڑے نے کہا" مجھے اچھا بتایا" برسات نے کہا" مجھے اچھا بتایا" گرمی نے کہا" مجھے اچھا بتایا" جاڑے نے کہا" بھئی وہ بڑھیا کیا تھی غضب کی پڑیا تھی۔ یہ نہیں بتایا کہ تینوں میں کون اچھا ہے۔ سب ہی کی تعریفیں کر مفت میں تین ہزار اشرفیاں مار لیں"۔ غرض تینوں چلے بھنے اس بڑھیا کی طرف آئے۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ پہلے میاں جاڑے پہنچے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑھیا تھر تھر کانپنے لگی۔

جاڑے نے کہا" بڑی بی سلام، مزاج تو اچھا ہے؟"

بڑھیا بولی" چل نگوڑے پرے ہٹ! بڑی بی ہوگی تیری ماں۔ اب جاتا ہے یا نہیں۔ خود تو روئی کا بنولا بن کر آیا ہے اور اس جاڑے میں غریبوں کا مزاج پوچھتا ہے۔ چل سامنے سے ہٹ دھوپ چھوڑ" میاں جاڑے نے کہا "بڑی بی میں جاڑا ہوں۔ سچ بتانا میں کیسا ہوں؟"

بڑی بی نے کہا" کہ آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنی تعریف چاہتے ہیں تو اپنی تعریف سنو۔ آپ آئے اس کو فالج ہوا۔ اس کو لقوہ ہوا، ہاتھ پاؤں پھٹے جا رہے ہیں۔ ناک سڑ سڑ بہہ رہی ہے۔ دانت ہیں کہ کڑ کڑ بج رہے ہیں۔ کپڑے ادھر پہنے کہ ادھر میلے۔ رضائی ہے کہ لٹکی پڑتی ہے

لحاف ذرا کھُلا اور ہوا سر سے گھُسی۔ بچھونے ہیں کہ برف ہو رہے ہیں سکھانا اِدھر اُترا اُدھر جما اور خدا نخواستہ کہیں جھاوٹ برس کر اولے پڑ گئے تو غضب ہوگیا۔ سی سی کر رہے ہیں۔ بتیسی بج رہی ہے۔ ناک معلوم ہوتا ہے کہ منہ پر ہے ہی نہیں۔ انگلیاں ہیں کہ ٹیڑھی ہوئی جاتی ہیں۔ آنکھوں سے پانی بہا جا رہا ہے۔ نہ کام ہو سکتا ہے نہ کاج۔ کہاں تک آگ تاپے اور دھوپ سینکے۔ توبہ توبہ! آگ کی بھی تو گرمی جاتی رہتی ہے۔ لیجئے اپنی تعریف سنی یا اور کچھ سناؤں ؟"

جاڑا چلا ہوا پہلے کا تھا ہی اور اب جو بڑھیا کی جلی کٹی باتیں سنیں تو اور جل کر کوئلا ہوگیا۔ اپنی ٹھوڑی پکڑ کر داڑھی کی جو ہوا دی تو بڑھیا کو لقوہ ہوگیا۔ چلتے چلتے دو ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔ ذرا فاصلے پر بی گرمی اور بی برسات کھڑی تھیں۔ ان سے کہا "لو جاؤ ان سے اپنا تصفیہ کرا لاؤ، ہم تو ہار گئے۔"

بی گرمی خوشی خوشی بڑھیا کے پاس آئیں۔ اور کہا "نانی اماں سلام" بڑھیا نے کہا "چل دور ہو نگوڑی میں تیری نانی کیوں ہونے لگی۔ آج مجھے نانی بنایا ہے کل کسی کو خصم بنا لے گی۔ اے ہے تو ایسی جوان جہان اور یوں جنگل جنگل

پھر رہی ہے - آوارہ ہوگئی ہوگی جو ماں باپ نے گھر سے نکال دیا - اور نکالا بھی ایک کپڑے سے - اچھا ہوا تم جیسے دلدّروں کے ساتھ ایسی ہی کرنی چاہیئے -

بی گرمی نے کہا " نانی اماں میں ہوں گرمی تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ گرمی کیسی ؟"

یہ سننا تھا کہ بڑھیا کے تو آگ ہی لگ گئی - کہنے لگی "اوہو چونی کہے مجھے بھی گھی سے کھاؤ - ابھی تمہارے بھائی صاحب اپنی تعریفیں سُن گئے ہیں - لو تم بھی سُن جاؤ - گرمی - گرمی کا کیا کہنا - سبحان اللہ' واہ واہ پسینہ بہہ رہا ہے - کپڑوں سے بُو آ رہی ہے - صبح کو کپڑے بدلے شام تک چکٹ ہو گئے کھانا کھایا کسی طرح ہضم نہیں ہوتا سینے پہ رکھا ہے - صبح ہوئی اور لُو چلنے لگی - اِس کو لو لگی اُس کو لُو لگی ' اس کو ہیضہ ہوا ' منہ جھلسا جاتا ہے ہونٹوں پہ پپڑی جمی ہوئی ہے - پانی پیتے پیتے جی بیزار ہوا جاتا ہے - پانی کیا ہے تتھڑے کا پانی ہے سینے پر اونٹ رہا ہے - زمین آسمان تپ رہا ہے دل پر آگ برستی ہے ' نیند آ رہی ہے - لیکن نہ اس کروٹ چین آتا ہے نہ اس کروٹ ' پنکھا ہے کہ ہاتھ سے نہیں چھوٹتا - ذرا ہاتھ رُکا اور دم گھٹنے لگا - ذرا خدا خدا کرکے نیند آئی اور کھٹمل

نے چٹکی لی۔ آنکھ کھل گئی پھر وہی مصیبت ' ہاں بیگم صاحب! کیوں نہ ہو۔ گرمی ہو۔ تمہاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چل دُور ہو میرے سامنے سے۔ نہیں تو ایسی بے نقط سناوں گی کہ تمام عمر یاد رکھے گی "۔

بی گرمی تو آگ بگولا ہو گئیں کہا " ٹھہر بڑھیا تجھے اس بدزبانی کا کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔ مجھے تو کیا سمجھتی ہے"۔ یہ کہہ کر جو پھونک ماری تو ایسا معلوم ہوا کہ لُو لگ گئی۔ بڑھیا تو ہائے گرمی کہتی رہی۔ بی گرمی پیٹ پر ایک دو ہتھڑ مار چلتی بنیں۔

جب ان کو بھی روکھی صورت بنائے آتے دیکھا تو بی برسات دل میں بہت خوش ہوئیں اور سمجھیں کہ چلو پالا مار لیا۔ بڑی مٹکتی مٹکاتی بڑھیا کے پاس گئیں اور کہا " نانی جان سلام "۔ بڑی بی نے کہا " بابا مار لو مار لو پھر مزاج پوچھنا۔ دو تو دل کی بھڑاس نکال چکے ' تم کیوں لگی لپٹی رکھتی ہو' بے وارث سمجھ لیا ہے جو آتا ہے مار جاتا ہے "۔

بی برسات نے کہا " میں نانی جان خدا نہ کرے میں کیوں مارنے لگی۔ وہ تو دونوں موئے ایسے ہی ہیں۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے بے چاری بڑی بی کو مار مار کر پلیتھن نکال دیا۔ نانی جان آپ بے خوف رہیئے میں ایسا بدلہ لوں

گی کہ وہ دونوں بھی تمام عمر یاد کریں گے"۔ یہ سن کر ذرا بڑھیا کے حواس درست ہوئے۔ آنکھ اٹھا کر کیا دیکھتی ہے کہ ایک جوان لڑکی نہائی دھوئی آبِ رواں کا دوپٹہ اوڑھے سامنے کھڑی ہے کہنے لگی "لڑکی کیا دیوانی ہے جو اس طرح گیلے بالوں سے شام کے وقت جنگل میں آئی ہے اور تیرا کوئی والی وارث بھی ہے یا نہیں جو اس طرح ماری ماری پھرتی ہے؟ جا اپنے گھر جا کر بیٹھ، کیوں باپ دادا کا نام بدنام کرتی ہے۔ اور ہیں تو تو بالکل ننگی ہے۔ جا جا دور ہو۔ میں تجھ جیسی لچی لفندریوں سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی"۔

بی برسات نے کہا "نانی جان خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں برسات ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ برسات کیسی؟"

بڑھیا نے کہا "برسات گو، درگو، مرغی کا گو، اے ہے برسات سے خدا بچائے۔ بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں۔ کلیجا دہلا جاتا ہے۔ دھما دھم کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ مکان بیٹھا وہ پاکھر گرا۔ جو مکان گرنے سے بچ گیا اس میں یہاں ٹپکا لگا وہاں ٹپکا لگا۔ اِدھر کے بچھونے اُدھر بچھ رہے ہیں کبھی اِدھر کا پلنگ اُدھر آرہا ہے باہر نکلنا مشکل ہے۔ ذرا پاؤں باہر رکھا اور چھینٹے سر سے اوپر آگئے۔ سواری پاس سے نکل گئی تو سب کپڑے چھینٹم چھینٹ ہو گئے۔

ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ ہوا بند ہے، اُمس ہو رہی ہے۔ کپڑے ہیں کہ چپٹے جا رہے ہیں۔ رات کو مچھر ستائے جا رہے ہیں۔ کھٹمل ہیں کہ کاٹے جا رہے ہیں۔ نہ رات کو نیند نہ دن کو چین۔ اور پھر اس پر بھی یہ سوال کہ نانی جان میں کیسی ہوں؟

نانی جان سے تعریف سُن لی۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ اے ہے یہ بے موسم کی گرج کیسی؟ خدا خیر کرے،" بڑھیا یہ کہہ رہی تھی کہ بی برسات کی نگاہ بجلی بن کر گری، اور بڑی بی کے پاؤں کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ ادھر بی برسات بڑھیا کو لنگڑا کر مُنہ پر تھوک رخصت ہوئیں۔ اُدھر ان کی بہو اور بیٹا اشرفیوں کی تھیلی لینے کے شوق میں پڑ کے نیچے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بڑی بی پٹی کٹی لونتھ پونتھ پڑی ہیں۔ بڑی مشکل سے لاد لود کر گھر لائے۔ خوب ہلدی چونا تھوپا۔ مرہم پٹی کی جب کہیں جا کر دس بارہ دن میں بڑھیا اس قابل ہوئی کہ اپنی کہانی بیان کرے۔ بہو اور بیٹے نے جو سُنا کہ بڑھیا نے جاڑے گرمی اور برسات کو بُرا بھلا کہہ کر اور اشرفیاں کھو کر جوتیاں کھائیں تو ان دونوں نے اس کو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا۔ اب بے چاری سڑک کے کنارے بیٹھی بھیک مانگا کرتی

ہے۔ مگر ایسی نک چڑھی کہ کوئی بھیک بھی نہیں دیتا بیٹا بات یہ ہے کہ اللہ شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ جو لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور موئے روتی صورت تو ہمیشہ جوتیاں کھاتے ہیں۔

پطرس بخاری

پطرس کا نام سیدا حمد شاہ بخاری ہے۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ اور یونیورسٹی میں اول آئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے علمی اعزاز کے ساتھ آنرز کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبیات انگریزی کے اُستاد ہو گئے۔ شعبۂ تعلیمات کو چھوڑ کر ریڈیو میں نوکر ہو گئے۔ اور ترقی کر کے تقسیم سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے۔ اِس کے بعد وہ اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل بنے، وہ پہلے پاکستانی ہیں جسے اتنا بڑا عالمی اعزاز عطا ہوا۔

پطرس کم نویس۔ ان کی ازلی شہرت گنتی کے چند مضامین پر قایم ہے۔ لیکن یہی چند مضامین اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک نئے باب کا درجہ رکھتے ہیں۔ پطرس نے ایک نیا اسلوب قایم کیا۔ وہ زندگی کے معمولی اور روزمرہ کے واقعات میں مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اس لئے انہیں اردو ادب کا اسٹفن لیکاک کہا جا سکتا ہے۔ زبان ان کے مزاج میں شرک کا درجہ رکھتی ہے۔ پطرس کے مزاح کو ہم کوئی خاص نام نہیں دے سکتے۔ ان کا مزاح ایک ذہنی کیفیت ہے۔ "مرحوم کی یاد میں" "لاہور کا جغرافیہ" "مرید پور کا پیر" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی"

یہ مضامین اُردو کے مزاحیہ ادب میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

طرزِ تحریر

پطرس انگریزی کے ایک اچھے ادیب تھے۔ انہوں نے انگریزی طنز و مزاح کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور انگریزی اثرات کو دل کش انداز میں اردو میں نمایاں کر دیا۔ پطرس کا اندازِ بیان بہت سادہ اور سلیس ہے۔ سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ کا اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ تحریر میں چار چاند لگ جاتے ہیں تحریر میں اردو کے ساتھ اکثر انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ پطرس معمولی طریقے پر انتہائی گہری بات کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا بار بار پڑھتا ہے اور لطف حاصل کرتا ہے۔ ایک ایک جملے میں ظرافت کے دریا موجزن نظر آتے ہیں۔ پطرس مزاحیہ ادب کی جان ہیں پطرس نے چند انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان ترجموں میں بھی ظرافت کی وہی شان ہے جو ان کے اپنے مضامین میں جھلکتی ہے۔ آپ کی تحریر میں بلا کی دلکشی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ پطرس کے علاوہ اردو ادب میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی ہے کہ جس نے صرف چند مزاحیہ مضامین لکھ کر اتنی شہرت حاصل کی ہو۔ یہ صرف پطرس کا ہی حصہ ہے۔

پطرس

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گذر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب میں کبھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں

اور کوئی موٹر اس ادا سے گذر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہونچ جائے تو اس دن میں گھر آکر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔ اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہو گا ہی نا آخر"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں ہم میں اور حیوانوں میں — کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم ذہن میں میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہدو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کے دُم ہوتی ہے تمہارے دُم نہیں لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف

یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں ہیں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں کچھ ہے تو کہو۔ پس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں۔ اس دن سے پیدل چل رہا ہوں، پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بے کار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوسروں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں۔ وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا

قابل توجہ ہی نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا۔ اچھا مرزا یونہی سہی دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں "۔۔۔

میں نے اپنے دانت پچی کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے"۔

مرزا بولے "ہوں"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگریٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے "ہوں"۔

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے میں

چاہتا تھا مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔
لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں"۔

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پہ دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں"۔

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خرید نے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں"۔

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً"؟

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا"

مرزا کہنے لگے "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے گا تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا آخر اس نتیجے پر پہونچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو"۔

میں نے کہا "وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا"۔

کہنے لگے "مفت"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مُفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے"۔

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچّے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو"

میں نے کہا "پھر کہنا پھر کہنا"

کہنے لگے "دیکھو ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے تو تمہاری ہے تم لے لو۔"

یقین مانئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کرلی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحمدلی کے صدقے معاف کردو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں دیکھو ناراض مت ہو انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کردیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں مجھے معاف کردو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔

جیسے میں سوار ہوا۔ ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی، اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں خریدی تھی لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پہ کالج آیا جایا کرتا تھا۔ اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں، پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا اتنے روپے

میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں، اوّل تو قیمت لینا نہیں چاہتا۔ لیکن ——"

میں نے کہا "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی' اچھا تم یوں کرو — میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمھیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں یہ تو کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمہاری مرضی میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا۔ استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارہ تو بالکل یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو لیکن مفت میں کیسے لے لوں آخر بائیسکل ہے ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور ٹانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس

یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے پچاس تو ہو نہیں سکتے، اور اگر ہو نہیں سکتے، اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دیدوں گا خدا کرے مرزا قبول کرے۔"

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔"

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا "کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا "کل صبح آٹھ نو بجے تک پہونچ جائے۔ دیر نہ کرنا۔ خدا حافظ —— اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپیوں کو بھی زیادہ سمجھنا —— خدا حافظ —— اور تمہارا بہت بہت شکریہ میں تمہارا بہت بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر دینا دیکھو نا کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں —— کل صبح آٹھ نو بجے —— ضرور —— خدا حافظ۔"

مرزا کہنے لگے "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا دینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا۔ ورنہ تم خود ڈلوا دینا۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل بھیج ضرور دینا۔ اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات تک پہونچ جائے۔ اچھا — خدا حافظ!!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر ارد گرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈرات کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گذر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑا اڑ رہا ہے وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی ہے۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔ صبح اٹھا تو اٹھتے ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔

میں نے کہا "اتنے سویرے؟"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہونچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔"

نوکر سے کہا "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ۔ اور دیکھو! ابے کہاں گا کہاں جا رہا ہے ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں تیل ڈالنے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا۔ اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل باہر نکال رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا ابھی مت رگڑنا بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے اوزار کو جیب میں ڈالا۔ اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی عجیب و غریب سین نظر پڑی ٹھیک پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا۔

"کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا۔ "حضور یہ بائیسکل ہے؟"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے۔ آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا۔" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور تیل لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا تو ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور راہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیئے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا: "وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم

ہوا جیسے کوئی مُردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف
زندہ ہوتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس
پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول
زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں
برآمد ہونی شروع ہوئیں ان کی آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔
چین، چاں، چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ ترگدی کے نیچے اور پچھلے
پہیئے سے نکلتی تھیں کھٹ کھڑ کھڑ۔ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں
سے آتی تھیں۔ چر چرخ۔ چرچرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے
نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا
تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی
تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ
گھومنے کے علاوہ جھومتا تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور
اس کے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا
تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے مڈگارڈ تھے تو
سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے ان کا فائدہ صرف یہ معلوم
ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں
غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے
رہیں گے۔ اگلے پہیئے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس

کی وجہ سے پہیہ ہر چکّر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور زور سے اوپر اُٹھ جاتا تھا اور سر پیچھے کو یوں جھٹکا کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکّے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیئے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ ——— کی صدا نکل رہی تھی جب اُتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آ گیا اور بائیسکل کے کئی اور پُرزے جو اب سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے ادھر اُدھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں چوں پھٹ۔ چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ، چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گذری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا۔ لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہونچ جاتے تھے۔ کمر دُہری ہو کر باہر نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے

پہیوں کی اٹھکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔
گدی کا نیچا ہو جانا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا اس لئے میں نے مناسب ہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کروں چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اُترا بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں خاموشی سی چھا گئی ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہوا۔
دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔
ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا تھوڑی دیر بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور

میں ہمہ تن زمین کے قریب پہونچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدّی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔ جب دو میل گذر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دوکان پر لیگیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔

ایک مستری آگے بڑھا لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدّی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک کر دوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا "اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا "اچھا کر دو۔"

بولا "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لوگے؟"

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لگیں۔"

ہم نے کہا "بس جی، جو کام تم سے کہا ہے کرو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدّی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا "میں نے کس تو دیا ہے۔ لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "بدتمیز کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟"

بولا "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا — للّو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے

سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گذر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا۔ "واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مستری نے کہا "ہاں تو وہ ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغا بازی پر ایک طویل تقریر کرتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر و شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا ہی خسارہ۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع

نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دوکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دُکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامّل کے بعد منھ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے"۔

دکان دار کہنے لگا "پھر"

میں نے کہا "لوگے؟"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم"۔

دُکان دار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے آخر کار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دوکاندار بولا "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہوں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "تمہیں بتاؤ۔"

کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں"

پھر کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اُٹھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصّے کے مارے کانپنے لگے میں نے کہا۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقہ کے انسان، مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آلگی ہے آسمان میرے سر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گذر گیا اور اِدھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اِرد گِرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں

باقی ماندہ سائیکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ لئے پھرتا۔ جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو تمہارا ارادہ کیا ہے؟ دو پہیئے کا ہے کو لے جا رہے ہو؟"

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ جو ہنس رہے ہیں انہیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قسم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو چلتے جاؤ۔"

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک ڈالیئے"۔ ایک دوسرے صاحب بولے "بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھاؤں گا"۔ ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھو بیٹا سرکس کی بائیسکل ہے اس کے دونوں پہیئے الگ ہوتے ہیں"۔

لیکن میں چلتا گیا تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا اب میری رفتار میں عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا چلتا گیا حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے

دونوں بہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا، مرزا بولے "اندر آجاؤ"

میں نے کہا "آپ ذرا تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ ہی مفت مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا:

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو

آپ دُنیا کے چند چوٹی کے نامور راہنماؤں میں سے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں ہوئی۔ ہیرو اسکول لندن اور کیمبرج کالج میں تعلیم پائی۔ بیرسٹر بن کر ہندوستان لوٹے۔ مہاتما گاندھی کے زیر اثر میدانِ سیاست میں وارد ہوئے۔ چالیس سال کی عمر میں اپنی قابلیت اور قربانی کے بل بوتے پر انڈین نیشنل کانگریس کے صدر چنے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو آپ اس کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ آپ کے عہد کے دوران ہندوستان نے ہر پہلو میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔ آپ امن و آشتی کے پیغمبر تھے۔ جمہوریت اور سوشلزم میں اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ کی وفات ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہوئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو

ایک یادگار وصیّت

مجھے میرے دیش کی جنتا نے، میرے ہندوستان کے بھائیوں بہنوں نے اتنا پریم اور اتنی محبّت دی ہے کہ میں چاہے کچھ کروں، وہ اس کے ایک چھوٹے سے حصّے کا بھی بدلا نہیں ہو سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت ایسی انمول چیز ہے کہ اس کے بدلے میں کچھ دینا ممکن ہی نہیں۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ہوئے جن کی اچھائی اور بڑائی کی وجہ سے ان کی عزت کی گئی ہے اور جن کو پوجا گیا ہے۔ لیکن بھارت کے لوگوں میں جن میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہر طبقے کے بھائی بہن شامل ہیں، مجھے اتنا زیادہ پیار دیا ہے کہ اس کا بیان کرنا بھی میرے لئے مشکل ہے۔ میں اپنے آپ کو اس محبت کے بوجھ تلے دبا پاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کے باقی دنوں میں اپنے ہم وطنوں کی

خدمت کرتا رہوں اور اپنے آپ کو ان کی بے پایاں محبّت کا اہل ثابت کروں۔

میں اپنے بے شمار ساتھیوں کا بھی احسان مند ہوں، جن کے ساتھ میں بڑے بڑے کاموں میں شریک رہا ہوں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں تو ان میں کامیابی بھی ہوتی ہے اور ناکامی بھی، مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ کامیابی کی مسرّت اور ناکامی کے دُکھ میں برابر کے شریک رہے۔

میں چاہتا ہوں اور سچے دل سے چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا اور محض رسم سمجھ کر انھیں اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کے برابر سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد میری لاش کو جلا دیا جائے۔ اگر میں کسی دوسرے ملک میں مروں تو میری لاش کو وہیں جلا دیا جائے اور میری راکھ الہ آباد بھیج دی جائے اور اس میں سے مٹھی بھر حصّہ گنگا میں بہا دیا جائے اور اس کے بڑے حصّے کو کیا کیا جائے، یہ میں آگے بتا رہا ہوں اس کا کوئی حصّہ بھی کسی حالت میں بچا کر نہ رکھا جائے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، گنگا میں راکھ

بہانے کی خواہش کسی مذہبی خیال سے نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مجھے بچپن ہی سے گنگا اور جمنا سے لگاؤ رہا ہے اور جیسے جیسے میں بڑا ہوا یہ لگاؤ بڑھتا رہا۔ میں نے موسموں کی تبدیلی کے ساتھ، ان ندیوں کی رنگوں کو دیکھا ہے اور صدیوں سے جو تاریخ، قصّے، کہانیاں، گیت اور سنگیت ان کے ساتھ جڑ گئے ہیں اور ان کے بہتے ہوئے پانی میں گھل مل گئے ہیں اس پر سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔

گنگا تو خاص بھارت کی ندی ہے۔ جنتا کو پیاری ہے۔ ہندوستان میں مختلف نسلوں کا آنا ہوتا، اُن کی امیدیں اور ان کے اندیشے، اُن کی ہار اور جیت کی کہانی گنگا کے سینے میں چھپی ہوئی ہے۔ گنگا تو ہندستان کی پُرانی تہذیب کی نشانی ہے، سدا بدلتی، سدا بہتی، پھر وہی گنگا کی گنگا۔ وہ مجھے یاد دلاتی ہے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی، گہری وادیوں کی، جن سے مجھے پیار ہے۔ ان کے نیچے زرخیز میدانوں کی جہاں کام کرتے میری زندگی گزری ہے۔ میں نے صبح کی روشنی میں گنگا کو مسکراتے، اچھلتے کودتے دیکھا ہے، شام کے سائے میں اُداس، کالی سی چادر اوڑھے ہوئے۔ جاڑوں

میں سمٹی ہوئی آہستہ آہستہ بہتی سُندر دھارا اور برسات میں دوڑتی ہوئی، سمندر کی طرح چوڑا سینہ لئے اور سمندروں کو برباد کرنے کی طاقت لئے ہوئے بھی گنگا میرے لئے نشانی ہے بھارت کی قدیم تہذیب کی، جو آج تک بہتی ہوئی آئی ہے اور جو زمانۂ حال میں سے گذرتی ہوئی مستقبل کے مہان ساگر کی طرف بہتی چلی جا رہی ہے۔

اگرچہ میں نے پُرانی روایتوں، ریتوں اور رسموں کو چھوڑ دیا ہے۔ میں چاہتا بھی ہوں کہ ہندُستان ان تمام زنجیروں کو توڑ دے، جن میں وہ جکڑا ہوا ہے، جو اس کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں اور دیش میں رہنے والوں میں پھوٹ ڈالتی ہیں جو بہت سے لوگوں کے لئے بوجھ بنی ہوئی ہیں اور ان کے پھولنے پھلنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ اگرچہ میں یہ سب چاہتا ہوں، پھر بھی میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنے کو پُرانی باتوں سے بالکل الگ کر لوں۔ مجھے اپنے اس عظیم ورثے پر فخر ہے، جو ہمارا رہا ہے اور ہمارا ہی ہے اور مجھے یہ بھی اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں بھی ہندُستان کے دوسرے لوگوں کی طرح اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں، جو کبھی نہیں اور کہیں نہیں ٹوٹتی اور جس کا ایک سرا ہندوستان کی قدیم تاریخ تک پہنچتا ہے۔ میں اس

بندھن کو ہرگز نہیں توڑنا چاہتا کیوں کہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور یہ میرے دل میں اُمنگیں اور ولولے پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو آخری عقیدت پیش کرنے کے لئے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میری مٹھی بھر راکھ الہ آباد میں گنگا میں بہادی جائے تاکہ وہ اس عظیم ساگر میں پہنچے جو ہندوستان کو گھیرے ہوئے ہے۔

اپنی راکھ کے باقی حصّے کے متعلق میری آرزو ہے اسے ہوائی جہاز میں لے جاکر ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں بھارت کے کسان محنت و مشقت کرتے ہیں تاکہ وہ بھارت کی مٹی میں مل جائے اور وطن کی خاک میں میری مٹی مل کر ہندستان کا ابدی حصّہ بن جائے۔

تلاش

امتیاز علی تاج

بیگم قدسیہ زیدی

امتیاز علی اردو ادب کے جدید دور کے نامور ڈراما نگار ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے ادب سے لگن پیدا ہوئی۔ آپ نے ڈراما نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ لاہور کے مشہور اور بلند درجہ پبلشرز "دار الاشاعت" نے امتیاز تاج کے لکھے ہوئے ڈرامے شایع کرنا شروع کیا۔ آپ کا ڈراما "انار کلی" خصوصاً قابل ذکر ہے۔ اسے بجا طور پر تاج کا شاہکار کہا جاتا ہے۔

امتیاز علی تاج مزاحیہ اور مضحکہ خیز مضامین لکھنے میں بھی خاص مہارت رکھتے تھے۔ آپکی لکھی ہوئی کتاب "چچا چھکن" اس کی واضح مثال ہے۔ اس کے اخلاق و عادات کی پوری پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اندازِ تحریر مزاحیہ ہے اور پڑھنے والا بے حد لطف اٹھاتا ہے۔

بیگم زیدی کے ڈرامے سادہ زبان میں لکھے گئے۔ ان کے مکالمے خاص طور پر دلکش اور چست ہیں۔ اگرچہ آپ کے اکثر ڈرامے شرق و غرب کے ڈراموں پر مبنی ہیں لیکن بظاہر ہر لحاظ سے اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ان پر نقل یا ترجمے کا شبہ نہیں ہوتا۔ آپ نے سنکرت کا مشہور عالم ڈراما "شکنتلا" پڑھنے اور سمجھنے کے لئے سنسکرت زبان سیکھی۔ جب زبان سنسکرت پر آپ کو کافی عبور حاصل ہو گیا تو آپ نے شکنتلا کا ترجمہ اردو اور ہندی میں کیا۔ یہ ترجمہ قابل داد ہے۔

امتیاز علی تاج

تلاش

کِر دَار :- چچا - چچی - وڈو - چھٹن - بنّو - امامی - بندو - خانصاحب کا ملازم -

(دالان میں ایک چارپائی - ایک تخت جس پر میلے کپڑے رکھے ہیں، دو کرسیاں، ایک دو چھوٹی میزیں صراحی وغیرہ ہیں - فرش پر کاغذ، چھپٹیاں اور رسّی کے ٹکڑے پڑے ہیں پچھلی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو غسل خانہ میں کھلتا ہے - داہنیں ہاتھ کا دروازہ باورچی خانے کو، بائیں کا باہر جاتا ہے - سامنے دیوار پر ایک ربڑ کی تھیلی ٹنگی ہے -

جاڑے کا جاڑا ہے، صبح کے تین بجے ہیں - چچا سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے سو رہے ہیں - کمرہ ان کے خراٹوں سے گونج رہا ہے بائیں ہاتھ کا دروازہ کوئی دھڑ دھڑ پیٹ رہا ہے - جواب نہ ملنے پر پھر پیٹتا ہے)

چچا۔(لحاف میں سے ہاتھ نکال کر لیمپ جلاتے ہیں۔ پھر نہایت احتیاط سے منہ لحاف میں سے نکالتے ہیں۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر) لاحول ولا قوۃ! کون ہو جی (زور دار دستک) دم بھی لوگے یا بیٹھے ہی جاؤگے کواڑ؟ (لحاف میں سے نکلتے ہیں۔ کنٹوپ پہنتے ہیں۔ رضائی اوڑھتے ہیں اور شُو شُو کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کے دروازے کی طرف جاتے ہیں) یہ بھی کوئی وقت ہے بھلے آدمیوں کو جگانے کا؟

(دروازہ کھول کر) ابے پاجی تو اس وقت کیا کر رہا ہے یہاں؟

ملازم۔ خانصاحب کے پیٹ میں بہت درد ہے۔ انہوں نے تمہاری ربڑ کی تھیلی منگوائی ہے۔

چچا۔ بس کھا گئے ہوں گے رات دعوت میں اناپ شناپ۔ آخر کھانا کسی اور کا تھا تو پیٹ تو خانصاحب کا اپنا تھا۔ (جمائی لے کر) کوئی یہ پوچھے کہ بھلا اناڑی کی سی توپ بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر پٹھان جو ٹھہرے اور پھر یہ کہ صبح تین بجے پیٹ میں درد کر لیا۔

ملازم۔ خانصاحب کے پیٹ میں تو دو بجے سے درد ہے۔

چچا۔ لیجئے ذرا غور تو فرمائیے۔ شریف آدمی کچھ تو وقت کا لحاظ رکھا ہوتا۔ بے وقت کی راگنی اسی کو تو کہتے ہیں۔

ملازم۔ اجی کوئی یہ بھی اپنے بس کی بات ہے؟

چچا۔ تو پھر کیا ہمارے بس کی بات ہے۔ خیراتی ہسپتال میں داخل کیوں نہ ہو گئے یہ تو گھر ہے کوئی شفا خانہ تو ہے نہیں کہ جس وقت جس کا جی چاہا سوتوں کو بے آرام کیا۔ اور ربڑ کی تھیلی طلب کر لی۔

ملازم۔ تو پھر ——

چچا۔ تو پھر کیا۔ اب آیا ہے تو لیتا ہی جا تھیلی۔ رُک۔ ہم ابھی لائے دیتے ہیں (دیوار پر سے تھیلی اتار کر دیتے ہیں۔ اور دروازہ بند کر لیتے ہیں) نامعقول انسان (کنٹوپ اور رضائی اُتار کر رکھ دیتے ہیں اور لحاف میں گھس جاتے ہیں۔ لیمپ بڑھا کر منہ لحاف سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک بار پھر کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے (لحاف میں سے منہ نکال کر) اب یہ کہلوایا ہوگا کہ انتقال فرما گئے ہیں آکر تجہیز و تکفین کا انتظام کر دو۔ مردود! (لیمپ جلاتے ہیں۔ جاکر دروازہ کھولتے ہیں تو خانصاحب کا نوکر تھیلی لئے کھڑا ہے)

ملازم۔ خانصاحب نے کہا ہے کہ اسے اپنے پاس انڈے دینے دیجئے۔ ہم بوتل سے کام چلالیں گے۔ اور اب کبھی ہم سے پالیش کی شیشی منگا کر دیکھئے گا۔

چچا۔ (تھیلی ہاتھ میں لئے دم بخود کھڑے ہیں) ارے کمبخت! صبح صبح

پرائیویٹ بات جا کر خانصاحب سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو ہم نے ــــــ

ملازم ۔ اور خانصاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ جب بیمار ہوں تو خیراتی ہسپتال چلے جائیے گا۔

چچا ۔ ذرا ملاحظہ تو فرمائیے شرافت خانصاحب کی، بھلا نوکر کے ہاتھ اخلاق سے ایسی گری ہوئی بات کہلوا بھیجنا کہاں کی انسانیت ہے (دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ ربڑ کی تھیلی تخت پر پٹک دیتے ہیں اور آ کر پھر لیٹ جاتے ہیں۔ پھر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ بڑبڑاتے پھر لیٹ جاتے ہیں) جیسے اُن کے باپ کی میراث میں مجھے ربڑ کی تھیلی ملی تھی ــــ ہونہہ، اور مزاج تو دیکھو پٹھان کا کہ اپنے ہی پاس انڈے دیتے دیجیے مرغی کا ــــ دھمکی دیتا ہے کہ پالش منگا کر دیکھئے (اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں) جیسے شہر بھر میں یہی تو ایک موچی رہ گیا ہے (لیٹ کر لیمپ بڑھا دیتے ہیں اور سونے کی کوشش کرتے ہیں) (لحاف میں سے منہ نکال کر) کمبخت اجالا ہی نہیں ہو چکتا کہ امامی چلم ہی بھر لاتا (بیٹھ جاتے ہیں) سارا گھر پڑا سو رہا ہے جیسے کم بختوں کو سانپ سونگھ گیا ہو (کھڑے ہو جاتے ہیں) افلاطون اور آخر اس میں جھوٹ بھی کیا ہے کہ گھر ہے کوئی خیراتی ہسپتال تو ہے نہیں کہ جس وقت جس کا جی چاہا سوتوں کو بے آرام

کیا اور ربڑ کی تھیلی طلب کر لی۔ (ٹہلنے لگتے ہیں) آخر کوئی چندے کی تھیلی ہے اور پھر یہ مزاج کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے۔ (دائیں ہاتھ کے دروازے سے باورچی خانے میں جاتے ہیں، وہیں سے) گھر داری کرنے چلی ہیں (اندر آتے ہیں) اتنی توفیق نہیں کہ سونے سے پہلے بھوبھل میں لکڑی دبا دیں (چارپائی کے پاس آتے ہوئے)، اور ہر وقت کی ضد کہ یہ کرتی ہوں میں وہ کرتی ہوں۔ میں کام سے مری جاتی ہوں (غصہ میں آکر) حالت یہ ہے کہ گھر میں پالش تک منگا کر رکھنے کا ہوش نہیں۔ ضرورت ہو تو ہمسایوں کے ہاں سے پالش منگایا جاتا ہے۔ (چارپائی پر بیٹھ کر) اور اس کم ظرف کو دیکھو کہ پالش کیا دے دی حاتم کی گور پر لات ماردی۔ جو برابر پالش لے لی تو یہ دے بیٹیں ربڑ کی تھیلی انہیں بخش دو۔ کمینہ کہیں کا (اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں) اور بیوی صاحبہ کو دیکھئے کہ جنہیں اتنا خیال نہیں کہ چلم کے لئے تھوڑی سی آگ کا انتظام کر دیں (بڑبڑاتے ہوئے کاغذ، چھپٹیاں، رسی وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ پھر باورچی خانے میں جا کر لوہے کی انگیٹھی لاتے ہیں۔ میز پر سے ماچس لے کر انگیٹھی میں آگ جلاتے ہیں) لیجئے اب ممنا کو تلاش کیجئے (پھر باورچی خانے میں جا کر لپٹن چائے کا گندا سا ٹین زمین پر پھینک دیتے ہیں) کم بخت خالی

پڑا ہے۔ تمباکو کی رمق نہیں اس میں۔ دیکھی اس کی حرکت جی میں آتا ہے حرام خور کا قیمہ کر کے رکھ دوں (آگ ٹھیک کرتے ہیں) ہزار تاکید کرو پر ان نوکروں کے کان پر جوں نہیں رینگتی (ٹکڑے ہو جاتے ہیں) اور اس بدمعاش کو دیکھو صبح صبح پرائیویٹ بات خانصاحب سے ٹھسکا دی۔ کوئی اس پاجی سے پوچھے میں نے خانصاحب کے خیراتی ہسپتال میں داخل ہونے کی بات اس لیئے کہی تھی کہ تو جا کر ان کے سامنے بیان کر دے (ٹہل کر) تجھے ربڑ کی تھیلی دی ہے تو چُپ چاپ جا کر اُن کے حوالے کر دے، تجھے دوسروں کے قصّے سے کیا سروکار —— اور پھر ان نواب صاحب کا مزاج کہ فرماتے ہیں تھیلی کو اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے بدتمیز جاہل —— یہ کم بخت امامی آج پڑا سوتا ہی رہے گا یا اُٹھے گا بھی (دائیں دروازے سے جاتے ہیں، باہر سے غصّے میں) حرام خور، بدمعاش، ہزار دفعہ نہیں کہا کہ ایک چلم تمباکو باقی رہے تو اور تمباکو فوراً لے آیا کر، اُٹھ یا سوتا ہی رہے گا (امامی کے رونے کی آواز) اُٹھ نہیں لگاؤں ایک اور لات، بھلا لاتوں کے بھوت کہیں باتوں سے مانتے ہیں؟

امامی۔ (دائیں دروازے سے اندر آتا ہے۔ چچا پیچھے پیچھے)

ہائے مرگیا ہائے مرگیا (بیٹھ جاتا ہے اور روتا ہے)
چچی۔ (دوپٹہ جوتی سنبھالتی ہوئی بائیں سے آتی ہیں) کیا ہوا؟
کیا ہوا؟ کیوں صبح صبح غریب پر برس پڑے؟
چچا۔ بس اس معاملے میں میری رائے محفوظ رہنے دیجئے۔
چچی۔ آخر معلوم تو ہو کہ صبح صبح اس غریب پر نزلہ کیوں گر رہا ہے؟
چچا۔ لا بتا کہاں ہے تمباکو؟
امامی۔ (منہ بسورتے ہوئے) میاں رکھا تو ہوا ہے تمباکو۔
چچا۔ تو ہم اندھے ہیں؟
چچی۔ رات ہی تو اس نے تمباکو کے لئے مجھ سے چار پیسے لئے ہیں۔
(دائیں کو چلی جاتی ہیں)
چچا۔ (جھک کر امامی کا کان پکڑتے ہیں اور اسے اٹھاتے ہوئے)
دکھا چل کر کہاں رکھا ہے تمباکو۔ تمباکو کے نام سے پیسے لے
کر ریوڑیاں اڑتی ہیں۔
امامی۔ (روتا ہے) نہیں تو۔
چچا۔ کیوں بدمعاش، رات کھا نہیں رہا تھا ریوڑیاں؟ اسی وقت
پیدا نہ کیا تمباکو تو میرے ہاتھوں جیتا نہ بچے گا۔
امامی۔ چلو میاں دکھاؤں۔
چچا۔ چلوں کیا۔ جا، جا کر لے آ۔
امامی۔ (بائیں سے باہر جاتا ہے اور ایک بھرا ہوا ٹین لے کر آتا

ہے) لو یہ رہا تمبا کو طاق میں رکھا تھا۔ رات ہی تو میں نے بھرا
تھا ڈبہ (روتا ہے)
چچا۔ پاجی، اے طاق میں تمبا کو؟ تمبا کو رکھنے کی جگہ طاق ہے دوکان ہی
میں نہ رکھ آیا حرامخور) یہ جگہ ہوتی ہے تمبا کو رکھنے کی؟
امامی۔ (کرتے سے آنسو پونچھتے ہوئے) بیوی جی نے کہا تھا۔
چچا۔ (چلاکر) اے بیوی جی کے بچے تجھے خود خیال نہ آیا کہ ضرورت
ہوگی تو طاق میں کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔
امامی۔ (آستین سے ناک پونچھتے ہوئے) بچے بلیاں گرا دیتی ہیں۔
چچا۔ بلیاں گرا دیتی ہیں، باتیں سنو بدمعاش کی۔ تمبا کو نہ ہوا دودھ
ہوگیا کہ بلیاں گرا دیتی ہیں۔
چچی۔ (دالان میں آکر غصے کو دباتے ہوئے) ہو چکی تفتیش۔
چچا۔ (جھنجلاکر) تمہاری ہی شہ نے نوکروں کو سر پر چڑھا دیا ہے
کہ تمبا کو کے ڈبے طاق میں رکھنے لگے ہیں۔
چچی۔ تو اور کہاں رکھیں۔
چچا۔ ہمیں کیوں کر معلوم ہو سکتا تھا کہ ڈبا طاق میں رکھا ہے۔
چچی۔ عقل سے کام لے کر۔
چچا۔ (کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ پھر رک جاتے ہیں۔ پھر سینے میں سانس
بھر کر کچھ کہنے کو ہیں رک جاتے ہیں) ناقص العقل (دبا ہیں ہاتھ
کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

چچی ۔ (امامی سے) بس چپ ہو جاؤ ۔ آج صبح سے ان کے سر پر بھوت سوار ہے صبح ہی صبح نہ اللہ کا نام نہ رسول کا ۔ غریب لڑکے پر پل پڑے ۔ جا، جا کر منہ ہاتھ دھولے (امامی بیچ کے دروازے سے غسل خانے میں جاتا ہے ۔ چچی بستر وغیرہ ٹھیک کرتی ہیں ۔ پھر دائیں سے باہر چلی جاتی ہیں ۔

چچی ۔ (باہر سے) منہ دھو چکا ہو تو اِدھر باورچی خانے میں آجا ۔

امامی ۔ ابھی آیا (غسل خانے میں منہ پونچھتا ہوا نکلتا ہے اور دائیں سے باہر چلا جاتا ہے)

چچا ۔ (بائیں سے اندر آتے ہیں چہرہ تمتمایا ہوا ہے بڑبڑا رہے ہیں) رڑکی تھیلی بخش دو ۔۔۔ باپ کی میراث ' موچی کہیں کا ۔

امامی ۔ (کشتی میں چائے لے کر آتا ہے) بیوی نے چائے بھجوائی ہے ۔

چچا ۔ (لے جا واپس اور کہہ دے کہ اسے ابھی اٹھا کر طاق میں رکھ دیں (امامی چائے لے کر چلا جاتا ہے) نوکروں کے سامنے کیا ہمسایوں کے سامنے تک مجھے رسوا کر ڈالا ۔ ورنہ اس پٹھان کی طاقت تھی کہ پالش کا طعنہ دے جاتا ۔۔۔ آخر کوئی حد بھی ہو ۔۔۔ بس ہو چکی ۔۔۔ اب نہیں اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ۔۔۔ مگر انکار ۔۔۔ جب دیکھو نوکروں کی طرف داری ۔۔۔ زندگی اجیرن کر ڈالی ۔۔۔ آیا تھا بڑا طاق ۔۔۔ طاق کا بچہ ۔۔۔ طاق میں پالش کی شیشی منگا کر نہ رکھی گئی ۔ شیشی

ہوتی تو میں کیوں منگاتا اس چمار سے پالش۔ میری عقل ماری گئی تھی ـــــ جو برابر پالش لے کر ربڑ کی تھیلی اٹھیں دے ڈالو۔ بڑے آئے کہیں کے۔

(دائیں ہاتھ کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اندر جھانکتے ہیں پھر واپس لوٹتے ہیں) ہم نہیں پئیں گے چائے۔ امامی کو پلا دیں (بائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

(ددّو اور چھٹّن اندر آتے ہیں۔ ددّو تولیہ ہاتھ میں لئے ہے۔ غسل خانے میں چلا جاتا ہے۔ چھٹّن لٹّو سے کھیلتا ہے۔ غسل خانے کا دروازہ بند ہے۔ پانی گرنے کی آواز آتی ہے چھٹّن لٹّو چھوڑ کر جاتا ہے اور غسل خانے کا دروازہ پیٹتا ہے)

چھٹّن۔ (جلدی نکلو، ہم بھی نہائیں گے۔

ددّو۔ (اندر سے) نہیں نکلتے۔ نہالیں گے تو نکلیں گے۔

چھٹّن۔ (دروازہ پیٹ کر) نکلو گے کیسے نہیں۔

ددّو۔ جاؤ جا کر اماں سے کہدو۔

چھٹّن۔ نکلو ـــــ نکلو ـــــ (دروازہ پیٹتا ہے۔ پھر جا کر لٹّو سے کھیلنے لگتا ہے) (چچا غصّے میں اندر آتے اور سیدھے غسل خانے کے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہے۔ چچا کا سر اس سے ٹکراتا ہے)

ددّو۔ (اندر سے) نہیں مانے گا تو چھٹّن میں اماں سے جا کر کہہ دوں گا

چھٹّن مجھے نہانے نہیں دیتا۔

(چھٹّن ہنسی کے مارے بے قرار ہو جاتا ہے۔ چچا سر سہلاتے ہیں پھر چھٹّن کو ہنستے ہوئے دیکھ کر (اس کی طرف لپکتے ہیں۔ چچی دائیں سے اندر آتی ہیں چھٹّن دوڑ کر چچی سے لپٹ جاتا ہے۔ چچا بے بس ہو کر لوٹتے ہیں اور چھٹّن دائیں کو چلے جاتے ہیں)

چچا۔ (غسل خانے کا دروازہ پیٹ کر) نکل باہر۔

دڈّو۔ (اندر سے) نہا تو لوں۔

چچا۔ نہیں ابھی نکل۔

دڈّو۔ صابن تو اتار لوں۔

چچا۔ کہہ جو دیا کہ ابھی نکل جیسا ہے ویسا ہی نکل۔

دڈّو۔ ابا صابن لگا ہے۔

چچا۔ آتا ہے باہر یا بتاؤں میں۔ صابن ہے تو ہوا کرے۔

(دڈّو صابن منہ پر اور جسم پر ملے دھڑ سے تولیہ لپیٹے باہر آتا ہے) پاجی کہیں کا نکل ہی نہیں چکتا تھا۔ اسے کہا جو تھا ہم نے جیسا ہے ویسا ہی نکل آ پٹخوائے چلا جاتا ہے (ایک چانٹا رسید کرتے ہیں)

دڈّو۔ (روتا ہے) صابن گھس گیا آنکھوں میں (روتا ہے)

چچا۔ فوراً غسل خانے میں گھس جاتے ہیں اور اندر سے چٹخنی چڑھا لیتے ہیں۔ دڈّو دروازے پر کھڑا رو رہا ہے) تو نہیں چپ ہو گا۔

(ددّو روتا ہے) دیکھ میں کہتا ہوں سرک جا یہاں سے، نہیں اچھا نہ ہوگا۔ میں دروازہ کھول کر اتنی لگاؤں گا کہ اماں ریڑ کی تھیلی سے سینک کرتی پھریں گی۔

چچی۔ (دائیں سے اندر آتی ہیں) کیا ہوا لال کیوں رو رہا ہے؟ آ جا تو میرے پاس آ جا۔

ددّو۔ (رو کر) ابا نہانے نہیں دیتے۔ غسل خانے میں سے نکال دیا۔ دیکھو تو اماں، سارے پنڈے پر صابن لگا ہے۔

چچی۔ حد کرتے ہیں بعض دفعہ تو بچّوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور آج صبح سے تو نہ جانے کیا آفت آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔ چل میں تجھے نہلا دوں۔ پھر کوئی اور کام کروں گی (چچی ددّو کو لے کر دائیں کو جاتی ہیں۔ چچا غسل خانے کا دروازہ کھول کر دیکھتے ہیں پھر بند کر لیتے ہیں۔ ددّو اور چچی لوٹ کر آتے ہیں)

چچی۔ (غسل خانے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر) چھٹن کے ابا دوسرا تولیہ لا دوں؟ تولیہ تو بچّہ باندھ کر چلا آیا ہے۔

(پانی گرنے کی آواز)

چچی۔ (ددّو سے) چل تو تو چل۔ نہیں لیتے تولیہ تو نہ لیں (دونوں چلے جاتے ہیں)

چچا۔ (دروازہ کھول کر اندر آتے ہیں۔ گیلا کرتہ پاجامہ پہن رکھا ہے)

ہونہہ (بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ پھر فوراً ہی اندر آتے ہیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہے ہوں۔ غسل خانے میں جاتے ہیں پھر اندر آتے ہیں۔)

نہ جانے کہاں چلی گئی (طاق میں تلاش کرتے ہیں) طاق سب چیزیں طاق —— بدمعاش "پالش کی شیشی منگوا کر دیکھئے گا"۔ بس یہی تو خرید سکتا ہے پالش اور تو سب قلانچ ہیں۔ ایک دم سے چھ شیشیاں خرید کر لاؤں گا اور سب کو طاق —— باجی حرامخور ممّی کو اٹھا کر طاق میں رکھ گیا مگر —— اس پٹھان کے ہاتھوں ذلیل کرا دیا۔ (پھر اکڑوں بیٹھ کر نعمت خانے کے نیچے دیکھتے ہیں) لاحول ولا قوۃ۔ گئی تو کہاں گئی (تکئے کے نیچے دیکھتے ہیں) آخر پر تو نہیں لگ گئے اُسے (تخت پر رکھے ہوئے کپڑوں کو ٹٹول کر دیکھتے ہیں) یہاں کبھی نہیں (چاروں طرف گھوم کر) اس گھر میں ہر چیز غائب ہو جاتی ہے پھوہڑپن کی حد ہو گئی بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر پالش کی شیشی منگوا کر رکھ لیتیں تو کیا حرج تھا (پھر تلاش میں لگ جاتے ہیں) تخت پر کے میلے کپڑے اٹھا کر ایک ایک کر کے جھاڑتے ہیں) کم بخت سوئی بھی ہوتی تو الگ ہو کر گر پڑتی لاحول ولا قوۃ الا باللہ (لوٹوں کے نیچے دیکھتے ہیں) سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ہو سکتی ہے۔ (ڈاڑھی کھجاتے ہیں) اچھا صبح سے

شروع کروں — صبح — خانصاحب — اپنے پاس انڈے
دینے دیجئے۔ بدمعاش! رات کے تین بجے پیٹ میں درد
کرلیا۔ تکلیف دہ انسان۔ اور یہ نہیں کہ صبح تک انتظار کرلیں،
نہیں لاٹ صاحب کے بچے رات کے تین بجے جگوائیں گے
شریف آدمیوں کو۔ اور اسے دیکھو کہ صبح صبح جاکر
پرائیویٹ بات خانصاحب سے کہہ دی۔ کمینہ کم
ظرف۔ بھلا یہ بات ان سے کہنے کی تھی (پھر بستہ
ٹٹولتے ہیں) یعنی حد ہوگئی۔ ارے او (رُک جاتے ہیں)
بندو! نامعقول۔ گدھا۔ خوب یاد آیا۔ صبح باورچی خانہ
میں گیا تھا۔ انگیٹھی لینے شاید وہیں رکھ دی ہو گی۔
(باورچی خانے میں جھانکتے ہیں) دیکھی بیگم صاحبہ کی
حرکت؟ ایسی چپ چپ اور انجان سی بنی بیٹھی ہیں
گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہونہہ! اس طرف نظر نہیں
اٹھائیں چہرے پر کیا پارسائی اور شہد بن برس رہا
ہے۔ (چٹکی بجاکر) اب آیا سمجھ میں۔ کھٹیارہ ہے نمازی
تو ضرور ہے۔ دغا بازی۔ انہوں نے ہی چھپا رکھی ہے۔
تبھی تو بے نیازی کا یہ عالم ہے — خیال ہو گا کہ
آخر ہار جھک مار کر مانگنے آئے گا (پھر جھانکتے ہیں)
اب اس طرف دیکھا نا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ چپکے

چھپکے میری پریشانیوں کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔ اس بچپن کی بھلا کوئی حد بھی ہے۔ میں نے بھی بیگم صاحبہ کا پاندان غائب نہ کیا ہو، تو کہنا (مودا اندر آتا ہے) کیوں بے مودے! بیوی کیا کر رہی ہیں؟

مودا۔ ہنڈیا بگھار رہی ہیں (چلا جاتا ہے، بائیں ہاتھ کے دروازے سے)

چچا۔ (ٹہلتے ہیں) کیا بیہودہ مذاق ہے۔ اور اگر میں ان کی اوڑھنی کو دیا سلائی دکھا دوں جب۔

(بنّو اندر آتی ہے۔ ہنڈکلھیا کا سامان لئے ہوئے ہے) ابّا میاں گڑ کے چاول کھاؤ گے؟

چچا۔ ادھر تو آ بنّو ایک کام کیجیو۔ ہماری عینک کھوئی گئی ہے باورچی خانے میں رکھی تھی۔ ڈھونڈ کر لا دے۔

بنّو۔ کون سی عینک؟

چچا۔ احمق کہیں کی۔ جو عینک ہم لگاتے ہیں اور کون سی، مگر دیکھ تیری اماں کو نہ معلوم ہونے پائے۔

بنّو۔ (مسکرا کر) اپنی عینک لگا تو رکھی ہے آپ نے۔

چچا۔ (چونک کر ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھاتے ہیں) ہیں! (اُتارتے ہیں۔ ہاتھ میں لے کر گھماتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ (پھر بنّو کی طرف دیکھ کر) یہ یہیں تھی۔ کب لگائی تھی ہم نے؟

بنّو۔ (زور سے قہقہہ لگاتی ہے) اماں !اماں! ہم تو اماں کو سنائیں گے۔
(بھاگنے لگتی ہے)

چچا۔ (لپک کر اسے پکڑ لیتے ہیں) ہیں ہیں !کیا ہوا ؟ کہاں چلی ؟
گلاب جامن کھائے گی، اری وہ بات تو ہم نے مذاق میں
کہی تھی۔ پاگل کہیں کی۔ اس میں اماں کو سنانے کی کیا
بات ہے۔ دیوانی ہوئی ہے۔ کیا لائیں تیرے لئے بازار سے؟

بنّو۔ (بھاگنے کی کوشش کرتی ہے) اماں ! اماں !!

چچا۔ تھپڑ ماروں گا میں۔

بنو۔ امّاں! امّاں !!

چچا۔ بدتمیز (بنّو کو دھکا دے دیتے ہیں۔ وہ گر کر رونے لگتی ہے
چچا جلدی سے بائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلے
جاتے ہیں)

چچی۔ (باورچی خانے سے) بنو، او بنو، کیوں ریں ریں کر رہی ہے
کیا ہوا ؟
(چچی دائیں سے آتی ہیں۔ بنو کو اٹھا کر پیار کرتی ہیں)
کیوں رو رہی ہے صبح صبح کس نے مارا ؟

بنو۔ ابّا۔۔۔۔ (رو کر) ابّا۔۔۔۔

چچی۔ کوئی شرارت کی ہو گی؟

بنّو۔ (ناک پونچھتے ہوئے) نہیں ابّا کی عینک۔۔۔۔

چچا۔ (بائیں سے اندر آتے ہیں۔ بڑی سی ٹوکری مٹھائی کی ہاتھ میں لئے ہیں) ایے او چھٹن، او للّو، چلو۔ آؤ ہم تمہارے لئے مٹھائی لائے ہیں۔ لے بنو بٹیا تو بھی لے۔

(سب کو مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ چچی باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں) لے ودو تو ایک اور حصہ لے اور بنو تو بھی لے (کاغذ پر مٹھائی رکھ کر) لے بندو یہ بیوی کو دے آ (بندو مٹھائی کو لے کر دائیں کو جاتا ہے۔ سب بچّے مٹھائی کھاتے ہیں)

چچا۔ (فٹ لائٹ کے قریب آکر) او امامی ذرا اِدھر تو آ یار۔ یہ لو تم ایک آنہ اور اگر کام کرو تو چوّنی انعام۔ دیکھ خان صاحب نکڑ کی دوکان پر حجام کے ہاں بیٹھے خط بنوا رہے ہیں۔ بائیسکل ان کا دوکان کے باہر رکھا ہے۔ تو چپکے سے جاکر ان کے بائیسکل میں پنکچر کر دیجیو —— بڑے آئے پالش کی شیشی والے ؛

پردہ

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ولادت ۱۸۹۷ء میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم قصبہ قرخ آباد اتر پردیش میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ علی گڑھ کے ایم۔اے۔او کالج میں داخل ہوئے۔ فضا یکسر مختلف تھی۔ ٹیپ ٹاپ اور دکھاوے کی زندگی تھی۔ ہر شخص سج دھج اور فیشن کا دلدادہ تھا۔ نوجوان ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے بڑے بھائی کی نگرانی میں تھے اب انہیں پرانی وضع کی سادہ زندگی ترک کرنے کو کہا جاتا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ ان کی سادہ زندگی کا مذاق نہ اُڑایا جائے۔ تھوڑی سی مدّت میں ہی ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے آپکو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ طلباء میں مقبولیت اور وقار حاصل کر لیا۔ آپکو بڑی قدر اور عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ آپ زبان کے بڑے میٹھے حاضر جواب اور ملنسار تھے۔ بحث مباحثہ میں طاق اور طرار تھے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ مزید تعلیم کے لئے جرمنی تشریف لے گئے۔ وہاں سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے مہاتما گاندھی کی سوانحعمری مرتب کی۔ مکتبۂ جامعہ کے لئے ایک دلکش دیوانِ غالب شایع کیا جو کلامِ غالب کی ایک بے مثال ایڈیشن ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

آخری قدم

آؤ، آج تمہیں ایک بہت اچھے آدمی کا حال سنائیں۔ جسے اس کے جیتے جی بہتیرے لوگ بُرا بُرا کہتے تھے اور مرنے کے بعد بھی اس کی نیکی کا حال بس وہی جانتے ہیں جن کے ساتھ اس نے بھلائی کی تھی۔ اور شاید بعضے تو ان میں سے بھی بھول گئے ہوں گے۔

اس نیک آدمی کے پاس بڑی دولت تھی۔ مگر یہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے دھن دولت کو اپنا نہیں سمجھتے بلکہ اللہ میاں کی امانت جانتے ہیں جو بس اس لئے ان کے سپرد کی جاتی ہے کہ اسے اس کے بندوں پر صرف کریں۔ خود ان کی اجرت یہ ہے کہ اس میں سے یہ بھی بس موٹا جھوٹا پہن لیں اور دال دلیا کھا کر گذر کر لیں۔

ہاں، تو یہ نیک آدمی بھی اپنی دولت سے خود بہت کم فائدہ اٹھاتا تھا۔ ایک صاف سے، مگر بہت چھوٹے مکان میں

رہنا تھا۔ گزی گاڑھے کے بہت معمولی کپڑے پہنتا تھا۔ اور کھانے کا کیا بتاؤں کبھی چنے چاب لیے، کبھی مکا کی کھیلیں کھالیں ایک وقت ہنڈیا چڑھی تو تین وقت کے کھانے کا انتظام ہوگیا۔ دوست احباب جنہیں اس کے حال کی خبر تھی طرح طرح سے اسے کھیل تماشوں میں، رنگ رلیوں میں، گھسیٹنا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانہ کرکے ٹال دیتا تھا۔ آخر کو سب میں بڑا کنجوس مشہور ہوگیا۔ اس کے دوست اُسے "میاں مکھی چوس" کہا کرتے تھے۔ بعض دوست اس کی دولت کی وجہ سے جلتے بھی تھے۔ وہ اسے اور بھی چھیڑتے اور بدنام کرتے تھے۔ مگر یہ دُھن کا پکا تھا۔ برابر چھپ چھپ کر چپ چپاتے اپنی دولت سے کسی نہ کسی مستحق کی مدد کرتا ہی رہتا تھا اور اس طرح کہ سیدھے ہاتھ سے دیتا تو اُلٹے کو خبر نہ ہوتی اور زبان پر ذکر آنے کا تو ذکر ہی کیا۔ نہ جانے کتنی بیوائیں اس کے روپیے سے پلی تھیں! کتنے یتیم اس کی مدد سے پڑھ پڑھ کر اچھے اچھے کاموں سے لگ گئے تھے۔ کتنے مدرسے اس کی سخاوت سے چل رہے تھے۔ کئی شفاخانوں میں دوا کا سارا خرچ اس نے اپنے سر لے لیا تھا اور ہزاروں دُکھی بیماروں کو بے جانے اس کے روپے سے روز آرام پہنچتا تھا۔ لیکن یہ مشہور تھا وہی "کنجوس مکھی چوس" "دنیا کا کُتا"، "نہ اپنے کام آئے نہ کسی اور کے"۔ کوئی اس پر ہنستا تھا

کوئی خفا ہوتا تھا۔ سب اُسے برا سمجھتے تھے!

آدمی کتنا ہی نیک ہو، دوسروں کے ہر دم برا کہنے سے جی دکھتا ہے اس کے دل کو بھی کبھی کبھی بڑی ٹھیس لگتی تھی۔ جھنجلاتا تھا آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے تھے مگر پھر صبر کر لیتا تھا۔

اس کے پاس ایک خوبصورت سی کتاب تھی چکنا چکنا موٹا کاغذ، نیلے کپڑے کی ٹھیک سی جلد۔ پشتے پر سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا "حسابِ امانت" اس کتاب میں یہ اپنا پیسے پیسے کا حساب لکھا کرتا تھا جس کو کبھی کچھ دیا تھا سب اس میں درج تھا کہیں کہیں کیفیت کے خانے میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی تھیں۔ یہ سب بعد کو لکھی گئی تھیں۔ کسی یتیم کو پڑھنے کے لئے وظیفہ دیا ہے۔ ۱۵ سال بعد کی تاریخ دے کر کیفیت کے خانے میں درج ہے" اب احمد آباد میں ڈاکٹر ہیں اور وہاں کے یتیم خانے کے ناظم" کتابوں کے ایک کاروبار کو سخت پریشانی کے زمانے میں دو ہزار روپے دیئے ہیں"کئی سال بعد کیفیت کے خانے میں لکھا ہے" آج خط آیا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم کی سیرت پاک نہایت صاف اور سادہ زبان میں لکھوا کر ایک لاکھ نسخے طلبا میں مفت تقسیم کئے ہیں۔ خدا جزائے خیر دے" دلی کے ایک مدرسے کو ایسے وقت کہ اس کا کوئی مددگار نہ تھا دس ہزار روپئے دیئے تھے۔ اندراج رقم کے سامنے کیفیت میں لکھا تھا" سالانہ رپورٹ پڑھی۔ ہر صوبے میں اس کی ایک ایک شاخ قائم ہو گئی ہے۔ اس صوبے میں تو گانوں میں تعلیمی مرکز قائم

کر دیئے ہیں۔ یہ کام نہ ہوتا تو اس ملک میں مسلمانوں کی تمدنی ہستی کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔" اسی قسم کے بے شمار اندراجات تھے۔

اس کتاب کو یہ اکثر اٹھا کر پڑھنے لگتا تھا۔ خصوصاً کسی نادان دوست کی زبان سے دل دکھتا تو ضرور اس کتاب کی ورق گردانی کی جاتی تھی۔ اُسے دیکھ کر کبھی کبھی مسکرانا بھی تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرتے وقت یہ کتاب ان لوگوں کے لئے چھوڑ جاؤں گا جو عمر بھر مجھے پہچانے بغیر میرا دل دکھاتے رہے۔ اس ارادے سے اُسے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ سو سُنار کی ایک لوہار کی۔ انھوں نے ہزار دفعہ میرا جی خون کیا ہے میں ایک دفعہ انہیں ایسا شرماؤں گا کہ بس سر نہ اٹھے گا۔ یہ سوچتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ ہوتے ہوتے بڑھاپا آن پہنچا۔ بدن جواب دینے لگا۔ روز کوئی نہ کوئی بیماری کھڑی ہے۔ ایک دفعہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سخت بیمار ہوا۔ بخار اور کھانسی ایک دن، دو دن تیسرے دن سینے میں سخت درد شروع ہوا۔ کوئی دو پہر غفلت رہی۔ ہوش آیا تو سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی تھی نمونیہ کا حملہ تھا اور سخت حملہ۔ شام سے حالت غیر ہونے لگی۔ بار بار غفلت ہو جاتی تھوڑی دیر کو ہوش آتا، پھر غفلت۔ کوئی چار بجے کے قریب ہوش آیا تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ اب وقت آن پہنچا ہے جو سب کے لئے آتا ہے اور جس سے کوئی بھاگ کر بچ نہیں سکتا۔ چارپائی کے پاس ہی میز پر وہ نیلی خوبصورت کتاب "حساب امانت" رکھی تھی جسے ابھی بیماری میں بھی

دو دن پہلے اٹھا کر پڑھا تھا۔ چند لمحے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ کتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کر اُسے اٹھانا چاہا۔ کئی مرتبہ کوشش میں اُسے مشکل سے اٹھا پایا۔ پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ عظیم الشان گھڑی اور یہ چھوٹا خیال...... ان کو شرما کر تجھے کیا ملے گا.... تو اپنا کام کر چلا...... اپنے کام سے کام..... منزل آپہنچی ...... آخری قدم کیوں ڈگمگائے؟ ...... دونوں ہاتھوں میں کتاب تھامی۔ ہاتھ تھرتھرا رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اٹھایا ہو۔ بڑی مشکل سے تکیے پر سے سر بھی اٹھایا اور ناتواں جسم کی ساری آخری قوت صرف کر کے کتاب کو اس پاس والی بڑی انگیٹھی میں پھینک دیا جس میں کوئی ڈھائی بجے نوکر نے بہت سے کوئلے ڈالے تھے اور میاں کو سوتا جان کر دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔

کتاب جلنے لگی۔ اس کی نظر اسی پر جمی تھی۔ جلد کے جلنے میں دیر لگی۔ پھر اندر کے کاغذوں میں آگ لگی تو ایک شعلہ اٹھا۔ اس کی روشنی میں اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ دکھائی دی اور چہرے پر ایک عجیب اطمینان۔ اُدھر مؤذن نے اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰہ کہا۔ اور نیکیوں کے اس کاروان سالار کی رسالت کے اعلان کے ساتھ ساتھ اس کی امت کے [illegible] راہرو نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

رشید احمد ۱۸۹۵ء میں جونپور کے ایک قصبہ مریاہو میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ چلے آئے اور ایم۔اے۔او کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں وہیں ایم۔اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ اسی کالج میں بحیثیت لیکچرار ملازم ہو گئے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی مزاحیہ مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ جب یہ کالج یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اور اردو کا باقاعدہ شعبہ قائم ہوا تو آپکو اس شعبے کا صدر مامور کیا گیا۔

تنقید نگاری: بطور ادیب اور نقاد رشید صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ادبی مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں کسی بھی حالت میں متانت اور گہرائی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کوئی بھی تحریک نئی ہو یا پرانی۔ اس کی پروفیسر رشید احمد صدیقی اندھا دھند پیروی نہیں کرتے آپ نے انگریزی ادب کا بھی کافی مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے اثر کو قبول کیا۔ رشید صاحب کی اہمیت اور مقبولیت کی وجہ ان کی تنقید نہیں بلکہ ان کی طنز نگاری اور انشا پردازی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

الکشن

جس زمانہ کا تذکرہ میں کر رہا ہوں۔ اس میں قانونی عدالتیں کچھ یوں ہی سی ہوا کرتی تھیں اور حاکم عدالت بھی ضابطہ یا قانون دانی کے اعتبار سے کچھ نیاز مند ہی سے ہوتے تھے۔ وکیل مختار بھی ایسے نہیں ہوتے تھے جیسے آج کل ہیں۔ آج کل کے قانون یا قانون دانوں کے کمالات دیکھ کر تو اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ افسوس تمام عمر یوں ہی گذار دی کیوں نہ کوئی سنگین جرم کیا، شہرت بھی ہوتی اور بری بھی ہو جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاً یہ خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ "رب کا شکر ادا کر بھائی" بغیر کسی جرم کے بھی تو سزا پا جاتے ہیں۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔

یہی حال ڈاکٹروں کا ہے ان کا کمال فن یہ ہے کہ مرض سمجھ میں نہ آئے تو کوئی ایسا مرض پیدا کر دینا چاہیئے جو سمجھ میں نہ آتا ہو۔ اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ مرض کچھ ہی کیوں نہ ہو علاج کسی دوسرے مرض کا

شروع کر دینا چاہیئے۔ اس طور پر کوئی تیسرا مرض یقیناً پیدا ہو جائے گا اور پھر اس کو قابو میں لانے کی کوشش کر لی جایا کرے گی۔ قابو میں آگیا تو خیر ورنہ جہاں تک مریض کا تعلق ہے پوسٹ مارٹم کے نتائج تو آسانی سے متعین ہو جائیں گے۔

ہاں تو میں تذکرہ کر رہا تھا اگلے زمانے کے حاکموں اور قانون دانوں کا، چنانچہ جن بزرگ یعنی حاکم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کی دعا سے ضابطہ یا قانون سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے اور وکیلوں اور مختاروں سے اتنے ہی خائف یا مشتبہ رہتے تھے جتنا خود ملزم حاکم عدالت اور وکیل مختار دونوں سے۔ حاکم نے سوچتے سوچتے یہ ترکیب نکالی کہ وکیل مختار سے گلو خلاصی حاصل کر لی جائے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ قانون کی گہری گہری ٹھوس باتوں سے دماغ یکسو نہیں رہنے پاتا اس لئے نفس معاملہ پر صحیح کچھ غلط کبھی نہیں ہے یعنی اس کے غلط ہونے کا کبھی امکان ہے مطلب کہنے کا یہ ہے کہ یہ بات ذرا گہری ہے اور ممکن ہے میں اسے واضح نہ کر سکتا ہوں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ کبھی کچھ نہ سمجھ سکے ہوں یا حاکم کی نیت بخیر نہ ہو۔

چنانچہ حاکم نے وکیل مختاروں سے کہا "حضرات! آپ لوگ قانون کی ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ نفس معاملہ گاؤ خورد ہو جاتا ہے اور انصاف کا حق ادا نہیں ہوتا اس لئے آپ لوگ خاموش

رہا کیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ فریقین خود ایک دوسرے سے بحث کریں۔ یہ خود بحث کریں گے تو حق کا فرشتہ یا ناحق کا شیطان فریقین متعلقہ کے سر اور چہرے کے ارد گرد حمد گاتا ہوا رقص کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اس طور پر عدالت کو صحیح فیصلہ صادر کرنے میں سہولت ہوگی وکلا، نے کچھ کہنا چاہا تو گرگ باراں دیدہ پیشکار نے حلبی شیشہ کی مَیلی عینک ناک کے پھننگ پر رکھ کر کہا: "صاحبو! اس معاملہ میں آپ لوگ خاموش ہی نہیں بلکہ عدالت کے کٹہرے سے ذرا دور ہٹ جایا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ورنہ جس وقت عدالت میں انصاف کے فرشتے یا ظلم کے شیطان کا نزول ہوگا۔ اس وقت ان نو واردوں کو اس امر کے سمجھنے میں سخت دشواری ہوگی کہ ظالم یا مظلوم کون ہے: عدالت فریقین، یا وکلاء؟ یہ تو کہئے حاکم کے سر پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ غیبی مہمانوں کا عدالت کے کمرہ میں نازل ہونا کوئی معمولی بات ہے؟"

غرض حاکم کا حکم بحال رہا۔ فریقین خود اپنے حقوق ایک دوسرے پر جتاتے اور عدالت بجائے خود کسی نتیجہ پر پہنچتی۔ اور اسی کے مطابق فیصلہ صادر کرتی۔ کچھ دنوں یہی لیل و نہار رہے حق کے فرشتے اور ناحق کے شیطان آتے رہے۔ حاکم کے سر پر خدا کا سایہ بھی قائم رہا۔ البتہ پیشکار پر وکیل مختاروں کا سایہ ذرا ضرورت سے زیادہ گہرا پڑنے لگا۔

ایک دن عدالت نوشیروانی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ فریقین پیش

ہوئے لب و لہجہ میں حرارت پیدا ہوئی۔ حرارت سے چنگاری برآمد ہوئی۔ چنگاری نے شعلہ کا رنگ پکڑا یہاں تک کہ ایک دھما کا ہوا اور ناحق کے شیطان نے حق کے فرشتہ کو دبوچا، سر سے بلند کیا اور زمین پر دے مارا۔

فلک گفت احسن ملک گفت واہ

عدالت نے فوراً فیصلہ صادر کیا یعنی شیطان حق پر تھا اور فرشتہ ناحق پر۔

حاکم نے آرام کرنے کا راستہ لیا۔ پیشکار اور وکلاء طلب ہوئے۔ فیصلہ کی داد چاہی گئی۔ حاضرین نے تخلیہ میں نہایت ادب سے دریافت کیا کہ یہ از غیبی فیصلہ کیوں کر صادر کیا جاتا تھا اور اس رمز سے دنیا آگاہ ہو جائے تو حق و ناحق کے جھگڑے بڑی آسانی سے طے ہو جایا کریں۔ حاکم صاحب پہلے تو سوچ میں پڑ گئے پھر ڈھیلے پڑے اور بہرحال بادل ناخواستہ سا انداز اختیار کر کے مسکرائے اور پھر بولے "تم کو اتنی سی بات نہیں معلوم کہ حق کی آواز کوئی دبا نہیں سکتا۔ میں فریقین کی بحث کو اتنے غور سے نہیں سنتا جتنا ان کے لب و لہجہ اور تیور اور بحث کے انجام پر نظر رکھتا ہوں۔ چنانچہ جس کو یہ دیکھتا کہ چیخ و پکار گالی گلوچ مار دھاڑ کے اعتبار سے چرب پڑ رہا ہے اسی کے موافق فیصلہ دیدیتا تھا اس لئے کہ حق کی آواز کبھی دبائی نہیں جا سکتی۔ اس راز کا انکشاف ہونا تھا کہ حاضرین پہلے تو

دم بخود ہوئے پھر کسی نے حاکم کی طرف دیکھ کر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے لگائے اور کسی نے پیش کار سے مخاطب ہو کر دھن ہے مہاراج کی جے کار لگائی۔ حاکم کے ہاتھ چومے پیش کار کے پاؤں چومے اور کانوں پر ہاتھ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

انصاف کرنے کا یہ طریقہ ایک راز تھا جو صرف حاکم صاحب پر منکشف ہوا تھا تھوڑا بہت پیش کار پر بھی۔ چنانچہ جس حادثہ یا فیصلہ کا تذکرہ ابھی ابھی کیا گیا ہے، یہ پیش کار ہی کی مخبری کا نتیجہ تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ منھ سے نکلی ہوئی پرائی بات، انصاف کا یہ طریقہ کچھ پیٹنٹ تو کرایا نہیں گیا تھا پھر موجودہ دور کے ذرائع و وسائل آمد و رفت جیسے بے پناہ ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔ انجام یہ ہوا کہ یہ چیز ساری دنیا میں پھیل گئی ہے اور اسی اصول پر دنیا میں انصاف کا کاروبار ہو رہا ہے جس میں خدا رکھے الکشن بھی شامل ہے۔

یہی حالت ہماری زندگی کے تمام نشیب و فراز میں پائی جاتی ہے۔ اسی کو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کہتے ہیں۔ اسی کا نام مسابقت رکھا گیا ہے اسی کو تہذیب کا علم یا تمدن کی فتح کہتے ہیں اور خدا جانے اور کیا کیا کہتے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع تو تھا مگر بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے خود یاد نہیں آتے ورنہ یقین مانئے کہ کسی نہ کسی طور پر ضرور سنا دیتا۔

ہاں تو بات میں بات نکل آتی ہے یعنی آج کی صحبت میں ریڈیو والے اس امر کے درپے ہیں کہ الکشن کے بارے میں میرے آپ کی گلخپ ہو جائے آپ کو معلوم ہو جائے آپ کو معلوم ہے کہ ہندستان میں برسات کے موسم میں بالعموم لوگ کشتی لڑتے ہیں جھولا جھولتے ہیں اور پھلوریاں کھاتے ہیں۔ سیلاب آیا تو درخت پر چڑھ گئے ہیضہ ہوا تو اسی درخت کے بھوت یا دنیت بن گئے۔ لیکن یہ بات تو عوام یا جُہلا سے متعلق ہے۔ مہذب لوگ ایسا نہیں کرتے وہ کشتی کے بجائے الکشن لڑتے ہیں۔ کونسلوں میں بھینگیں بڑھاتے ہیں اور کمیٹیوں میں پکوان اڑاتے ہیں۔ سیلاب آئے یا سوکھا پڑے یہ اپنے حلقۂ انتخاب میں ما مقیماں پڑھتے رہتے ہیں۔

مُرغِ شاخِ درخت لاہوتیم

مرغ اور شاخ پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ واقعہ اکثر بے موقع ہی یاد آتا ہے اور یہاں مجھے غیر متعلق سا بھی معلوم ہوتا ہے لیکن آپ معاف فرمائیے۔ اگر میں اسے یہاں بیان کردوں آپ کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور میرا اخلجان دور ہو جائے گا۔ یعنی یہ واقعہ یاد آنا بھول جائے گا۔ وہ واقعہ میں سنائے دیتا ہوں موقع آپ تلاش کرلیجیے گا کیونکہ ہم آپ پڑھتے آئے ہیں گو برتنے کا کبھی موقع نہ ملا کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔

ایک دن یہی الکشن کی فصل تھی ووٹ لینے کے لئے لوگ

موٹر ڈنڈے اور لٹھ لئے ہوئے میری تلاش میں نکلے تھے۔ صرف تین امیدوار تھے اور میں نے تینوں سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ایک سے تو اس بنا پر کہ مجھ پر اس کے روپئے واجب تھے، دوسرے سے یوں کہ میں اس کا کاشتکار تھا اور تیسرے سے اس لئے کہ یہ شخص بات کرتے کرتے یا تو کبھی خود رو پڑتا تھا یا مجھے مار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

ظاہر ہے ایسی حالت میں میرے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ میں اتفاق سے ایک ایسے مقام پر جا نکلا جہاں ہر طرف عجیب و غریب قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ کہیں گراموفون بج رہا تھا، کہیں کھانے پکانے اور کھلانے کا انتظام تھا۔ ایک طرف سنپیرا سانپ کے اور دوسری طرف مداری بندر بھالو اور بکری کے کرتب دکھا رہا تھا۔ ایک طرف سبیل لگی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ناچ رنگ کا سامان تھا۔ ایک جگہ کچھ لوگ لکچر دے رہے تھے۔ لکچر اور حاضرین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید کوئی منجملہ کسی سنیاسی یا فقیر کی بنائی ہوئی جڑی بوٹیوں کے خواص بتا رہا تھا۔ ابھی میں اسی حیص بیص میں تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ ایک صاحب نے نہایت دوستانہ انداز میں پیچھے سے آ کر میری گردن پکڑی اور آگے پیچھے کھینچ ڈھکیل کر جیسے رائفل میں کارتوس بھرے جاتے ہیں، بولے کیوں آپ کا نام

بندو خاں ہے چلئے ووٹ دیجئے اور یہ بیڑی پیجئے بڑا انتظار دکھایا۔
میں نے دوستی کا اعتراف ابھی اسی حد تک کیا تھا کہ بیڑی لینے
پر آمادہ ہوا تھا کہ ایک دوسرے صاحب نے مجھے اپنی طرف گھسیٹا
اور بولے خبردار' بدھو خلیفہ میرے ووٹر ہیں۔ لڑکپن میں ہم دونوں
کپاس چرایا اور مار کھایا کرتے تھے۔ کیوں خلیفہ بھولے تو نہیں ابھی ہیں
نے پورے طور پر حافظہ کا امتحان نہیں لیا تھا نہ دیا تھا کہ ایک تیسرے
بزرگ آگے بڑھے اور میرا گریبان کھینچ کر بولے واہ میر بھئے! تم
نے تو کنویں جھنکوا دیئے ایسا بھی کیا غائب ہونا' چلو کچھ کھا پی لو
اس کے بعد مجرا سنیں گے لیکن اس سارے قضیہ کا انجام یہ ہوا کہ
مجھے اسی کمرے میں لے گئے جہاں ووٹروں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔
اصلی شخص جس کا ووٹ پڑنے والا تھا بندہ حسن تھا۔ کلرک نے پوچھا
"بندہ حسن کون ہے" میرے ایک دوست نے مجھے آگے بڑھا کر کہا۔
"صاحب! ان کا اصلی نام بندہ حسن ہے لیکن یہ نام ماں باپ نے
رکھا تھا ورنہ عام طور پر ان کو بندو خاں کہتے ہیں" دوسرے نے کہا "اللہ کے
بھائی اللہ سے ڈرو بدھو خلیفہ ہمیشہ بدھو خلیفہ ہیں اسی نام سے ووٹ
دیں گے" تیسرے نے لپک کر للکارا "ارے لوگو خدا سے ڈرو یا نہ
ڈرو حوالات سے تو ڈرو' میر بنے کو بدھو خلیفہ کہتے شرم نہیں آتی"
کلرک نے گھبرا کر مجھ سے پوچھا "آخر تم کیسے چپ ہو۔ تم ہی بتاؤ
تمہارا کیا نام ہے"

میں نے کہا "حضور اپنا اصلی نام مجھے بھی ٹھیک نہیں معلوم لیکن کشتی لڑتا تھا تو اکھاڑے میں بندے خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ غازی میاں کا علم اٹھانے لگا تو بدھو خلیفہ کہلایا اب نفیری اور فیرنی بیچتا ہوں تو لوگ میر بتے کہنے لگے" کلرک بھی زندہ دل تھا۔ بولا تم نے آنے میں جلدی کی ورنہ یہی لوگ تم کو اس ممبر کی حیثیت سے پیش کر دیتے جس کے تم ووٹر سمجھے جاتے ہو، لیکن اب یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں"

میں بھاگا اور سارا مجمع میرے پیچھے ہو لیا۔ ایک ہلڑ مچ گیا اور مشہور یہ ہوا کہ میں بچوں کو چرانے جایا کرتا ہوں۔ قریب تھا کہ مجمع کے ہاتھوں صبر و شکر قسم کی کوئی چیز بن جاتا کہ میں ایک گلی میں ہو لیا اور شور مچایا کہ پولنگ اسٹیشن پر بلوا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجمع پولنگ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا اور میں بھاگا۔ گرتا پڑتا سامنے ایک عالی شان عمارت تھی اس میں داخل ہوا اور بے ہوش ہو گیا۔ یہ جانوروں کا عجائب خانہ تھا۔ دوسرے دن آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ قریب ہی ایک اخبار رکھا تھا جس میں نہایت جلی حرفوں سے یہ خبر چھپی تھی — "کونسل ہال میں ایک انارکسٹ کا حملہ اور دربان کی عدیم المثال بہادری" یہ باتیں تو بقول چہار درویش یا فسانۂ عجائب "اے حاضرین با تمکین و صاحبان صدر نشین" اپنی جگہ پر رہیں اور آپ انھیں اپنی جگہ پر رہنے نہ دیں گے

تو کیا مجھے جیل خانہ بھجوا دیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ الکشن بہت اچھی چیز ہے خدا کی دین ہے یعنی اللہ دے اور بندہ لے۔ اس محاورہ کے استعمال میں ممکن ہے مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ الکشن نہایت اچھی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ ابھی ہندوستان کی فضا اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یہاں الکشن میں بالعموم اسی کی فتح ہوتی ہے جس کے پاس روپیہ ہے یا جس سے لوگ ڈرتے ہیں۔ ووٹروں کو فکر و عمل کی آزادی نہیں ہے۔ مستثنیٰ حالتوں کے علاوہ یہاں کامیاب ممبر کے بارے میں یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب کا صحیح نمایندہ ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ الکشن کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس بے روزگاری کے دور میں الکشن نفع بخش چیز ہے۔ مثلاً آپ کسی کے مقابلہ میں کھڑے ہو کر خوب ہنگامہ مچائیے۔ دولت مند امیدوار آپ کو روپئے دے دلاکر بیٹھ رہنے پر راضی کرے گا۔ اس کے بعد آپ اس کے کارکن بن جائیں گے تو اور روپئے مل جائیں گے۔ آپ ذرا ایماندار قسم کے آدمی ہوں تو کوئی قومی ادارہ کھول دیجئے مثلاً مدرسہ یتیم خانہ پنجرہ پول وغیرہ اور کہئے کہ آپ کے ادارہ کو پانچ سو

روپئے دلائے جائیں تو آپ بیٹھ رہیں گے، روپئے مل جائیں گے۔
ظاہر ہے کہ آپ اس سلسلے میں اپنی زیر باریوں کی تلافی کے لئے
زرعطیہ سے کچھ نہ کچھ وصول ہی کرلیں گے۔ اور اس سے بھی
زیادہ ظاہر ہے کہ آپ اتنے خوش قسمت نہیں ہوں گے کہ اتنی
ذرا سی رقم سے آپ کی تمام زیر باریاں دور ہو جائیں گی۔

اب رہا یہ امر کہ الکشن نہ ہو تو کیا ہو اس پہ مجھے ایک قصہ
یاد آیا۔ کسی گاؤں میں ایک لال بجھکڑ رہتے تھے۔ ایک دفعہ
کوئی سخت معاملہ پیش آگیا جس کو سلجھانے کے لئے لوگ لال بجھکڑ
کے یہاں ایک وفد لے گئے۔ لال بجھکڑ سے کون نہیں واقف ہے
بہت ممکن ہے اس وقت آپ کے آس پاس بیٹھے ہوں اور
اپنا نام سُن کر کان کھڑے کریں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ
آپ جس کے کان نمایاں دیکھیں ان کو لال بجھکڑ قرار دے دیں۔
واقعہ یہ ہے کہ کانوں سے لال بجھکڑ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور
کانوں ہی کیا لال بجھکڑ کا کان، ناک، آنکھ، زبان کسی سے کوئی
واسطہ نہیں۔ وہ صرف عقل سے کام لیتے ہیں۔ لال بجھکڑ عقل
سے جس قسم کے کام لیتے ہیں اس قسم کا کام عقل سے دوسرے
نہیں لیتے لیکن یہاں کچھ خلط مبحث ہو رہا ہے۔

واقعہ صرف یہ ہے۔ گاؤں والے ایک مشکل میں مبتلا ہو گئے
تھے، چنانچہ وہ ایک وفد لے کر لال بجھکڑ کے یہاں گئے۔ لال بجھکڑ

نے سارا واقعہ سُن کر ایک چنگھاڑ ماری اور زار و قطار رونے لگے۔ ابھی لوگوں کا تعجب ختم نہیں ہوا تھا کہ موصوف رُکے۔ اور ایک سخت قہقہہ مار کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں نے جذبات کے اس نشیب و فراز کی حقیقت دریافت کی تو لال بجھکڑ یوں گویا ہوئے "بھائی! رویا تو یہ سوچ کر کہ اب اس گاؤں کے ایسے بُرے دن آن لگے ہیں کہ لوگ ذرا سی بات پر مجھ سے رجوع کرنے پر مجبور رہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو کیا ہو اور ہنسا یوں کہ وہ بات میری بھی سمجھ میں نہ آئی"

پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور سنہ ۱۹۱۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے قرآن شریف کے علاوہ ایک مکتبہ میں تھوڑی سی فارسی پڑھی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں سینٹ جانسن کالج آگرہ سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر علی گڑھ چلے آئے اور سنہ ۱۹۳۴ء میں یہاں ایم۔ اے انگلش پاس کر کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار مامور کئے گئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں مضمون اردو کا ایم - اے کیا اور شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں رضا پور کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ریڈر بنائے گئے اور لکھنو یونیورسٹی میں کام کرنے لگے۔ یہاں آپ اردو اور فارسی پڑھاتے رہے۔ دس سال یہاں کام کرنے کے بعد آپ علی گڑھ واپس آ گئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں آپ کو یہیں شعبۂ اردو کا صدر مامور کیا گیا۔

سرور صاحب کی اصلی شہرت کا میدان تنقید نگاری اور شاعری کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ کو ابتدائی دور میں شعر و شاعری کے ساتھ گہری دلچسپی رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۵ء میں آپکی نظموں کا پہلا مجموعہ "سلسبیل" شایع ہوا۔ اس میں اکثر نظمیں کشمیر سے متعلق ہیں۔ کشمیر کے ساتھ سرور صاحب کو والہانہ عقیدت ہے۔ مضامین "تنقیدی اشارے" "تنقید کیا ہے؟" "نئے اور پرانے چراغ" "ادب اور نظریے" شایع ہوئے۔ لکھنو میں قیام کے دوران پھر شاعری کا جذبہ اُبھرا جس کا نتیجہ "ذوق جنوں" تھا۔ سائینس اور ادب سے گہری واقفیت رکھنے کے سبب سرور کی تنقیدوں میں وسعت نظر اور گہرائی پائی جاتی ہے آپکے جائزے منصفانہ اور ناقدانہ ہیں۔ اس سے آپکی تصنیفات میں لطافت اور ندرت پیدا ہو گئی ہے آپکی تنقید تاریخی اور سماجی اثرات کو نظر انداز نہیں کرتی لیکن ادبی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتی ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور

اُردو ناول کا ارتقاء

ناول انگریزی لفظ ہے۔ انگریزی اثر کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے ہاں قصے کہانیوں کا وجود نہ تھا' یا داستان سرائی رائج نہ تھی' یہ کہنا واقعات سے انکار ہوگا' الف لیلا' طلسم ہوشربا' بوستان خیال' باغ و بہار' فسانۂ عجائب سب قصہ کہانیاں نہیں تو کیا ہیں' ان میں تخیل کی پرواز' حق و ناحق کا تصادم' حسن و عشق کی آویزش' کردار نگاری کے نمونے' انداز بیان کی خوبصورتی سب کچھ موجود ہے۔ ان کا پڑھنے والا ایک طلسمی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں عجیب و غریب شخصیتیں اسے مسحور کر لیتی ہیں۔ اور عجیب و غریب کارنامے حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ ایسی ایسی باتیں سنتا ہے ایسے ایسے مناظر دیکھتا ہے جنہیں ہماری اس مادی کثیف بے رنگ و بے ربط زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں' ان داستانوں کو پڑھ کر آدمی مبہوت

ہو سکتا ہے قائل نہیں ہو سکتا۔ اس کا وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے، عاقبت نہیں سدھرتی، وہ کھو جاتا ہے، کچھ پاتا نہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے زندگی اور اس کے مسائل کو بھول جاتا ہے، زندگی اسے نہیں بھولتی۔

ان قصے کہانیوں اور ناولوں میں فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے۔ ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، رہا یہ امر کہ وہ زندگی کیسی ہے اور کس طرح پیش کی گئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ناول ایک مسلسل قصہ کا دوسرا نام ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح ہو مگر ایسا ہو سکتا ہے، ناول سے بہت کام لئے گئے ہیں جس طرح شاعری سے لئے گئے ہیں، اس کے ذریعہ سے طنز کے تیر برسائے گئے ہیں، وعظ و نصیحت کے دفتر کھولے گئے ہیں۔ سیاسی مسائل حل کئے گئے ہیں۔ مذہبی عقیدوں کو سلجھایا گیا ہے اور علمی مباحث بیان کئے گئے ہیں۔ مگر یہ سب ضمنی باتیں ہیں، ناول کا اصل مقصد تفریحی ہے، دلچسپی قائم رکھنا اس کے لئے ضروری ہے چاہے وہ "تصویر بتاں" اور "حسینوں کے خطوط" کے ذریعے سے ہو یا تصوف اور اخلاق کے مسائل کی موشگافیوں سے۔ یورپ میں ناول کو ادبیات میں اٹھارھویں صدی سے جگہ ملی اور انیسویں صدی میں یہ صفِ اول میں آگئی۔ اب اس سے جو کام لیا جاتا ہے وہ کسی اور طرح ممکن نہیں، یہ

زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی، خواب جوانی کی تعبیر بھی ہے اور سب سے بڑی تنقید بھی، یہ ڈراما یا مضمون سے زیادہ مکمل ہے۔ مضمون نگار زندگی کے متعلق اظہار خیال کرتا ہے۔ ڈراما زندگی کو شعلے کی لپک اور لہو کی دھار بنا کر پیش کرتا ہے مگر ناولسٹ زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے، زندگی کو دیکھنے کے بعد اُسے دوسروں کو دکھانا بھی ناول کا فرض ہے۔

ناول میں زندگی کے مختلف تجربات اور مناظر ہوتے ہیں۔ واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور فلسفۂ زندگی کی جھلک ہوتی ہے۔ ہر ناول ایک ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اور فطرت انسانی سے پردہ اٹھانے کی کوشش، ناول لکھنے کے لئے بڑی پختگی اور بڑے رچے ہوئے شعور کی ضرورت ہے۔ جبھی تو ایک نقاد کے نزدیک یہ ایک حکیمانہ اور فلسفیانہ کام ہے۔ قصہ گوئی انسانیت کی ابتدا سے ملتی ہے مگر ناول مہذب انسانوں کی ایجاد ہے۔ سرمایہ داروں نے افراد سے دلچسپی پیدا کی اور اس دلچسپی نے ناول کو جنم دیا۔

انگریزی میں رچرڈسن اور فیلڈنگ ناول کے موجد کہے جاتے ہیں، ہمارے یہاں نذیر احمد کی کہانیوں کو ناول کا اولین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ مکمل نمونہ نہیں پھر بھی ہم آسانی سے نذیر احمد سے پہلے کے قصے ان کے بعد کے قصوں سے الگ کر سکتے ہیں۔ بعد کے

قصوں میں ناول کی چند خصوصیات ملتی ہیں، یہ نذیر احمد کا تصرف ہے مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چند ہی سال بعد اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں توبۃ النصوح لکھی گئی، نذیر احمد کی یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی تھیں کہ ۱۸۷۹ء میں فسانۂ آزاد پہلے اودھ اخبار میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔

نذیر احمد کی کہانیاں تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ یہ شروع سے مقصدی تھیں اور اصلاحی۔ ان کہانیوں میں پلاٹ مکمل اور واضح ہے، ابتدا وسط اور تکمیل کا احساس پایا جاتا ہے۔ قصہ رفتہ رفتہ بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے مگر اشخاص قصہ جامد و ساکن معلوم ہوتے ہیں۔ اصغری شروع سے نیک اور سعادت مند ہے، اکبری اس کی ضد ہے۔ محمد عاقل اور محمد کامل کو جو حصہ قصہ کے شروع میں مل گیا وہ اسے آخر تک نبھاتے ہیں، ہر کردار پر ایک لیبل لگا ہوا ہے اور ناموں میں علامتی رنگت ہے۔ نصوح، فہمیدہ، عاقل فطرت، ظاہر دار بیگ، مبتلا۔ صادقہ اسی طرح کا غذ پر آتے ہیں جس طرح نیروا جیوپٹر کے سر سے برآمد ہوئی تھی۔ ان میں ترقی پذیری نہیں ہے۔ نذیر احمد کردار نگاری کے گر سے پوری طرح واقف نہیں۔ ان کے کردار فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان۔ نذیر احمد کا تعارف انھیں زندہ رکھتا ہے وہ اپنے سے زندہ نہیں رہتے۔ نذیر احمد سب کچھ بھول سکتے ہیں مگر وہ مقصد نہیں بھول سکتے جس کے تحت

وہ قصہ لکھتے ہیں۔ ان کے ناول جتنے اچھے وعظ ہیں اتنے اچھے قصے نہیں۔ وہ قصہ کو آزاد نہیں چھوڑ سکتے اور خود اس میں جا بجا دخل انداز ہوتے ہیں وہ راہ نجات کے زندگی سے زیادہ قائل ہیں، مگر ماحول کی مصوری ان کے یہاں بہت اچھی کی گئی ہے۔ اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندانوں کی اندرونی معاشرت کی جو تصویریں نذیر احمد نے کھینچی ہیں وہ ایسی سچی اور بے لاگ ہیں کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔ ان کے قلم میں بلا کا زور اور جوش ہے۔ اس کی وجہ ہے ان کی کہانیاں اب بھی مقبول ہیں اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ مراۃ العروس اور توبۃ النصوح الماریوں ہی میں محفوظ نہیں چھوٹے بڑوں کے دلوں میں محفوظ ہیں یہی ان کی ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی ہونے کے باوجود دلچسپ ہیں اور مقصدی ہونے کے باوجود زندہ۔

اسی زمانے میں سرشار نے قصے لکھنا شروع کئے اور بہت لکھے، سرشار کو قصہ لکھنے کی تحریک اودھ پنچ کے تفریحی مضامین سے ہوئی مگر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح نذیر احمد کی اولین تصانیف توبۃ النصوح اور مراۃ العروس ان کی شہرت کا باعث ہیں اسی طرح فسانۂ آزاد جو سرشار کا پہلا طبع زاد قصہ ہے، اپنے مصنف کا نام زندہ رکھنے میں کامیاب ہے۔ سرشار فسانۂ آزاد کی وجہ سے زندہ ہیں۔ دوسری تصانیف سرشار کی وجہ سے لوگوں کو یاد ہیں فسانۂ آزاد

بھی ناول کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔ اگرچہ اس کا مصنف اسے ناول کہتا ہے اور میاں آزاد کا ہر شہر و دیار میں جانا اور وہاں کی بری رسموں پر جھلانا ناول کا پلاٹ بناتا ہے۔ یہ ایک آزاد افسانہ ہے۔ اس میں نہ کوئی پلاٹ ہے نہ تسلسل، اس کی کردار نگاری کچھ زیادہ تسلّی بخش نہیں، زبان بھی کچھ کچھ مصنوعی اور حد درجہ شاعرانہ ہو گئی ہے اور قصہ بے طرح لمبا ہوتا چلا گیا ہے اور اکثر خلاف قیاس واقعات داخل ہوتے گئے ہیں، پھر بھی اس میں اس ماحول کی لازوال تصویریں ہیں جس میں سرشار نے اپنی آنکھیں کھولیں اور جن کو سرشار کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ آرنلڈ بینٹ نے لکھا ہے کہ تین چیزیں ناولسٹ کو پرکھنے کے لئے کافی ہیں۔ اس کا دائرہ عمل تنقید حیات اور اپنے افراد قصہ سے اس کا برتاؤ۔ سرشار اپنے دائرہ عمل میں اپنی مثال آپ ہیں ان کو لکھنؤ اور اس کے گردو نواح کی سوسائٹی سے عشق ہے۔ وہ بمبی میں ہوں یا قسطنطنیہ میں، لکھنؤ کی فضا پیدا کرنے سے باز نہیں رہتے، سیرت نگاری سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں، اور نہ سیرتوں کے تنوع سے وہ معاشرت کی تصویر بنانا جانتے ہیں۔ انھیں تو کارٹون اچھے بنانے آتے ہیں۔ ان کی خلاّقی ان کی سب سے ممتاز خصوصیت ہے۔ اس خلاّقی کا سب سے اچھا نمونہ تو خوجی ہے مگر سلارو، اللہ رکھی، سپہر آرا میں بھی اسی کی وجہ سے جان پڑ گئی ہے۔ نوابوں کے دربار، بیگمات کی زبان سرشار کے خاص مضمون ہیں۔ یہاں ان کا قلم خوب جوھر دکھاتا ہے۔ ظرافت

کی وجہ سے لمبے لمبے اور اکثر خلاف قیاس مکالموں کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔ سرشار اپنے پڑھنے والوں کو ہنسانے کے لئے خود ہنستے ہیں۔ وہ زندگی کو قہقہوں میں اڑانا چاہتے ہیں۔ وہ ایک زوال آمادہ تمدن پر طنز کرتے ہیں مگر اس کے دلدادہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا طرز نثر اردو کے ارتقا کے لحاظ سے نذیر احمد سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ فسانۂ عجائب کی ترقی یافتہ صورت ہے، وہ نذیر احمد کے مقابلے میں داستانوں سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی خلاقی اور ماحول کی مصوری انہیں نذیر احمد سے بڑا ناولسٹ بناتی ہے۔

سرشار کے نام کے ساتھ شرر کا نام آنا ضروری ہے۔ ایک طرف سرشار کا مقابلہ رجب علی سرور سے کیا جاتا ہے دوسری طرف شرر سے شرر نے مضمون لکھے تاریخیں لکھیں اور ناول لکھے مگر ملک میں وہ ایک ناول نویس کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے بیشتر تاریخی ناول لکھے ہیں، ان میں جہاں تک پلاٹ کے ارتقا کا تعلق ہے چستی اور حسن ترتیب دونوں موجود ہیں شرر سرشار سے بہتر ہیں وہ جانتے ہیں کہ داستان کا ڈھانچہ کتنا ضروری ہے، وہ دلچسپی قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، کردار نگاری کے زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے شرر کو اردو کا والٹر اسکاٹ کہا گیا ہے مگر اسکاٹ بہتر فنکار ہے۔ شرر، نذیر احمد کی طرح اپنا تبلیغی مقصد نہیں بھولتے اور انہیں جزئیات پر اتنی قدرت ہے جتنی اسکاٹ یا نذیر احمد کو۔ اسکاٹ جس ماحول کی تصویر

پیش کرتا ہے وہ منہ سے بول اٹھتا ہے۔ شرر کے عربی سپاہی ہندوستانی جذبات سے متاثر ہوتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا صرف نام عربی ہے، شرر کے سب ہیرو یکساں ہیں۔ ان میں کوئی بھی انفرادی خوبی نہیں۔ سب کے سب بہادر، نیکدل اور حسین ہیں۔ شرر کا خیال ہے کہ عورتوں کے نزدیک مردوں میں بھی یہی خوبیاں ضروری ہیں۔ فطرت کی بھول بھلیاں اور جذبات کی گہرائیاں شرر کے بس کی نہیں۔ ایک طرف زیاد، حسن، منصور اور عزیز میں کوئی فرق نہیں دوسری طرف ورجینا، انجلینا یکساں ہیں صرف موہنا میں ایسی دلاویزی موجود ہے کہ وہ المیہ (TRAGEDY) کی ہیروین کہلانے کی مستحق ہے۔ ادبیات میں اس کے مقابلہ کی چند ہی عورتیں مل سکتی ہیں۔ فردوسی کی منیژہ، زہر عشق کی ہیروئن اور ٹالسٹائی کی اینا کرنینا ANANKRANINA میں جو سیرت کی بلندی۔ ارادہ کی پختگی اور عشق کی حرارت ہے وہی موہنا میں ہے۔ میرے خیال میں شرر کے بہترین ناول فردوس بریں اور منصور موہنا ہیں۔ شرر دراصل جرنلسٹ ہیں۔ اگر ان کے یہاں گہرائی اور واقعیت زیادہ ہوتی تو وہ بہتر ناولسٹ ہوتے۔

شرر کے ساتھ ساتھ اودھ پنچ اسکول کے ناول بھی قابل ذکر ہیں۔ سجاد حسین نواب آزاد اور جوالا پرشاد برق کے تراجم اردو ناول کی تاریخ میں اہم ہیں۔ لیکن اس مختصر صحبت میں ان کا تفصیل سے ذکر کرنا

ناممکن اور نامناسب ہے۔ حکیم محمد علی کے تاریخی ناول بھی تاریخی اعتبار سے کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں۔ انھوں نے شرر کے طرز پر تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے مگر ناول کو آگے نہ بڑھا سکے۔

قصہ مختصر اب تک ناول زیادہ تر قصہ کہانی کے چکر میں رہے۔ ان سے نذیر احمد نے اصلاح، سرشار نے طنز اور شرر نے تبلیغ کا کام لیا، اودھ پنچ والوں نے قدامت کی طرف سے جدیدیت کو روکنے کی آخری کوشش کی لیکن زمانے نے انھیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ زبان کے لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ ادبیت نذیر احمد کے یہاں ہے۔ سرشار کی تصانیف صحرائی مناظر کی طرح ہیں (جہاں بے حد خوبصورت قطعے اور نہایت بدنما سین گڈمڈ ملتے ہیں) شرر کا انداز بیان اگرچہ انگریزی سے متاثر ہے مگر کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔

مرزا رسوا کے ناولوں سے ایک نیا رنگ شروع ہوتا ہے، امراؤ جان ادا، شریف زادہ، ذات شریف کا مصنف جدید رنگ کا ہے رسوا نے تاریخی ناول کو چھوڑ کر حقیقت نگاری کو شعار بنایا، انھوں نے اپنے ناولوں کو اپنے زمانے کی تصاویر سے سجایا بسایا۔ روزمرہ کی زندگی سے پلاٹ اخذ کئے اور چند معمولی شخصیتوں کو لے کر ان کی عظمت اور دلآویزی کا احساس دلایا۔ رسوا نے فطرت انسانی کا غائر مطالعہ کیا ہے، ان کا طرزِ تحریر صاف، واضح اور رواں ہے۔ انھیں خود اپنے ناولوں کے نئے ہونے کا احساس ہے ایک جگہ لکھتے ہیں، ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی

نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوئے ہیں اور نہ ان میں کسی نے خودکشی کی ہے، نہ ہجر ہوا ہے نہ وصل، ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔
بقول ایک فاضل کے "امراؤ جان ادا" ایک دلچسپ قصہ ہے جس کی زبان دُھلی منجھی اور سلجھی ہوئی اور اندازِ بیان نہایت دل نشیں ہے، اس قصے میں ایک ایسا حسنِ انتظام اور اس کی تعمیر میں ایسا توازن ہے جو کم اُردو ناولوں کو نصیب ہے۔ رسوا پہلے ناولسٹ ہیں جو معلمِ اخلاق ہونے کے علاوہ فنکار بھی ہیں اور فن میں ضبط و تنظیم اور ڈرامائی احساس کے قائل ہیں۔

اب ہم اس زمانے میں آتے ہیں جب نئی نسل کبھی ادب لطیف کے ذریعہ سے کبھی نیچرل نظموں کے پیرائے میں کبھی قومی اور اخلاقی سرمایہ سے اُردو ادب کو مالا مال کر رہی تھی۔ راشد الخیری کے ناول عورت کی مظلومیت کی داستان ہیں مگر ان کے اصلاحی جذبہ، ان کے تبلیغی انداز، ان کی خطابت، ان کی جذباتیت ان کی اُکتا دینے والی یکسانیت، راشد الخیری کو اس میدان میں کوئی بڑا درجہ نہیں دینے دیتی، ادب لطیف کے علمبرداروں نے جہاں بھی حسن تھا اس کی پرستش کی، انھوں نے ناول بھی لکھے، مگر دراصل وہ انشاپرداز تھے ناولسٹ نہ تھے۔

پریم چند اردو ادب کے بہت بڑے افسانہ نگار ہیں انھوں نے کئی اچھے ناول لکھے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ دراصل وہ افسانہ نگار ہیں، انھوں نے اردو ناول کو اچھی خاصی وسعت عطا کی بازارِ حُسن، چوگان ہستی، گوشۂ عافیت، پردہ مجاز۔ نرملا، غبن، میدانِ عمل اور گئو دان سب دلچسپی سے پڑھے

جا سکتے ہیں، ان میں گئودان اور اس کے بعد گوشۂ عافیت سب سے بہتر ہیں، چوگانِ ہستی کا پہلا حصّہ کامیاب ہے مگر دوسرا ضرورت سے زیادہ طویل ہے۔ یوں بھی پریم چند کے ناول ذرا زیادہ ہی لمبے ہو جاتے ہیں۔ اب تک جتنے ناول نکلے وہ صرف زندگی کے ایک گوشے کی تصویر بناتے پر قانع تھے۔ پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات، وہ ایک اچھے قصہ گو اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے نہیں لکھتے، وہ یہیں کے مال سے اپنی دکان بساتے سجاتے ہیں، مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں، وہ انسانی فطرت کو جانتے ہیں، اگرچہ نفسیات انسانی کی گہرائیاں ان کے بس کی نہیں۔ ان کا مشاہدہ تیز و قوی ہے اور انہیں کرداروں کا پیدا کرنا اور انہیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دینا خوب آتا ہے، ان کی حقائق نگاری میں شعریت نرائی ملتی ہے اور ایک بے تابی، ایک آوارہ نگہی ٹپکتی ہے جو آرنلڈ بینٹ کی یاد دلاتی ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی، ان کا ایک تصورِ حیات ہے، وہ غریبوں اور مظلوموں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں۔ کسانوں کے جذبات اور دیہاتی زندگی کے مرقعے ان کے یہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں، جہالت، غربت اور بیماری، رسم و رواج کا بھوت، دولت کی غلط تقسیم، مذہب کے نام پر انسانیت کا خون، پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا۔ وہ نہایت شریف آدمی ہیں اور بعض تلخ حقایق کی تاب نہیں لا سکتے وہ مرد عورت کی محبت کو بیان نہیں کر سکتے، ان کے یہاں جذباتیت

زیادہ ہے، ان کے کرداروں میں بہت جلد انقلاب آتا ہے۔ پریم چند کا خیال ہے کہ انسان کی فطرت نہ بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے) اگر حالات گردوپیش اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان۔ وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہے مگر پریم چند اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہے، پریم چند ایک تصور حیات رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کی بھول بھلیاں دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مصلحانہ کوششوں کو بعض انقلاب پرست اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ پریم چند اس خلیج کو پاٹنا نہیں چاہتے جو امیر و غریب کے درمیان ہے اُسے کم کرنا کافی سمجھتے ہیں بعض کے نزدیک ان کے ناول افسانوں کی مالا ہیں۔ ان میں قدرتی وسعت، پھیلاؤ اور نمو نہیں پھر بھی انھوں نے ادب کو بعض اچھے کردار دیئے ہیں، ہوری، دھنیا، سورداس، سمن، ونے، نرملا، گیان شنکر ان کے غیر فانی کردار ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی افراد کی شکست نہیں ہوتی بلکہ گروہ یا مقصد کی فتح و شکست ہوتی ہے۔ پریم چند کی زبان ناہموار ہے، فارسی کے فقروں کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اور ہندی لکھتے لکھتے فارسی پر اتر آتے ہیں، بایں ہمہ ان کا طرز سادہ عام فہم اور پُر زور ہے۔ سادگی میں جوش پیدا کرنا ان کا کمال ہے۔

پریم چند کے اثر سے اُردو میں افسانہ نگاری اور ناول کو ترقی ہوئی مگر ابھی ہمارے ناول مغربی ناولوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ ناول لکھنے کے لئے جس گہرائی، حسنِ ترتیب، تعمیری صلاحیت اور وسعت کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں ابھی نہیں آئی۔ ابھی تک ہماری حقیقت نگاری فوٹو گرافی اور ہماری خیال آرائی داستان گوئی ہے، ہاں ترقی پسند تحریک نے زندگی اور ادب کے متعلق جو بصیرت پیدا کی ہے اُس کے اثر سے ناول اور افسانہ کی دنیا میں اضافہ ہوا ہے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک افسانوں کی کثرت رہی۔ اب اچھے اچھے افسانہ نگار ناول کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ سجاد ظہیر کا ناولٹ لندن کی ایک رات، کرشن چندر کی شکست، عزیز احمد کا گریز اور عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر یہاں قابل ذکر ہیں۔ ان سب ناولوں پر مغرب کا اثر ہے، خصوصاً گریز اور ٹیڑھی لکیر پر۔ موجودہ انقلابی دور میں زندگی کی اچھی اچھی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور نئی قدروں کو ابھی جاگزیں ہونے کا موقع نہیں ملا، اس وجہ سے ادب میں وہ پختگی اور گہرائی نہیں جو بڑے ادب کی تخلیق کے لئے ساز گار ہو۔ اردو میں یوں بھی نثر کی عمر نظم سے بہت کم ہے۔ نثر کی جو ترقی اس زمانہ میں ہوئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں اگلا دور ناول کا دور ہوگا۔

اطہر پرویز

اطہر پرویز ایک مشہور و مقبول ڈراما نگار ہیں۔ آپ کے کئی ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے اور عوام و خواص سے خوب داد پائی۔ اسکول طلباء کے لئے کئی نصابی کتابیں لکھیں۔ آٹھ کتابوں پر آپ کو حکومت ہند کی طرف سے انعامات بھی حاصل ہوئے۔

آپ کی ولادت ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں الہ آباد میں ہوئی۔ قدیم رواج کے مطابق پرائمری مدرسے میں آپ کو قرانِ مجید کے ساتھ ساتھ شیخ سعدی کی "گلستان" اور "بوستان" بھی پڑھائی گئیں۔

آپ نے ۴۱-۱۹۳۹ء کے درمیان کرسچین کالج الہ آباد سے امتحان ایف۔ اے پاس کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۲ سال بعد ایم۔ اے فارسی پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے میدان سیاست میں قدم رکھا۔ سیاسی ورکر (WORKER) کے طور پر چار پانچ سال خوب کام کیا۔ حکومت کے خلاف جوش و خروش کے ساتھ تقریریں کیں اور جا بجا دورے کئے۔ سیاسی جد و جہد کے دوران آپ کو سزائے قید بھی بھگتنی پڑی۔ رہا ہوتے کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں بچوں کے مشہور رسالہ "پیام تعلیم" کے ایڈیٹر (EDITOR) مامور کئے گئے۔ آخر ۱۹۵۶ء میں رسالے کی ادارت سے مستعفی ہو گئے۔

۱۹۵۸ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو پاس کیا اور پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔

اطہر پرویز

محلّے کی ہولی

ڈرامے میں کام کرنے والے:

سوتردھار - نٹی

لالہ تیج رام - شہباز خاں (دو دوست)

سوشیلا (لالہ تیج رام کی بیٹی)

خالدہ (شہباز خاں کی بیٹی)

لالہ جی کی بیوی - خالدہ کی امّی

ننھا بچّہ (لالہ تیج رام کا سب سے چھوٹا بیٹا)

میر صاحب (شہباز خاں کے مخالف)

حافظ جی (شہباز خاں کے درپردہ مخالف)

پنڈت جی - ٹھاکر گوبند رام - پنڈت رام سرن - محمود میاں -

ایک لڑکا اور بوڑھا حلوا حلوائی -

ایک تماشائی

ایک لڑکا

پہلا سین

(پردہ کھلتا ہے۔ سوتر دھار بیٹھے ہوئے پنڈت نہرو کی وصیت پڑھ رہے ہیں)

سوتر دھار۔ گنگا تو خاص بھارت کی ندی ہے۔ جنتا کی پیاری ہے۔ ہندوستان میں مختلف نسلوں کا آباد ہونا، ان کی امیدیں اور ان کے اندیشے، ان کی ہار اور جیت کی کہانی، گنگا کے سینے میں چھپی ہوئی ہے۔ گنگا تو ہندوستان کی پرانی تہذیب کی نشانی ہے سدا بدلتی، سدا بہتی۔ پھر وہی گنگا کی گنگا —— وہ مجھے یاد دلاتی ہے؛ ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی، گہری وادیوں کی، جن سے مجھے پیار ہے۔ ان کے نیچے زرخیز میدانوں کی، جہاں کام کرتے میری زندگی گذر رہی ہے۔ میں نے صبح کی روشنی میں گنگا کو مسکراتے، اچھلتے کودتے دیکھا ہے اور دیکھا ہے شام کے سائے میں اُداس، کالی سی چادر اوڑھے ہوئے، جاڑوں میں سمٹی ہوئی آہستہ آہستہ بہتی سندر دھارا، اور برسات میں دوڑتی ہوئی، سمندر کی طرح چوڑا سینہ لئے اور سمندروں کی سی برباد کرنے کی طاقت لئے ہوئے یہی

گنگا، میرے لئے نشانی ہے، بھارت کی قدیم تہذیب
کی، جو آج تک بہتی ہوئی آئی ہے اور جو زمانۂ حال میں
سے گذرتی ہوئی مستقبل کے مہان ساگر کی طرف بہتی چلی
جارہی ہے۔

(نٹی تیزی سے اندر داخل ہوتی ہے)

نٹی۔ ارے یہ کیا گیتا کا پاٹھ ہو رہا ہے؟

سوترد ھار۔ یہ گیتا کا پاٹھ ہے یا پنڈت نہرو کی وصیت
ہے۔ کبھی پڑھی ہو تو جانو کبھی تمہیں تو لڑنے سے ہی فرصت نہیں۔

نٹی۔ جی ہاں! پڑھے لکھے تو بس تم ہی ہو۔ میں تو جاہل ہوں۔
مہمان ڈراما دیکھنے آرہے ہیں اور تم وصیت کا پاٹھ کر
رہے ہو۔

سوترد ھار۔ مہمان! مہمان!!

نٹی۔ جی، ڈراما دیکھنے آرہے ہیں، جس کا آپ نے اشتہار کیا ہے۔

سوترد ھار۔ یہ تم بھی کیا بات کر رہی ہو۔ کیسا ڈراما؟

نٹی۔ تم اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔

سوترد ھار۔ پھر وہی جھگڑے کی بات۔

نٹی۔ خیر اب اس بحث کو چھوڑو۔ ڈرامے کا فیصلہ کرو۔

سوترد ھار۔ کون سا؟

نٹی۔ کوئی تاریخی ڈراما کرو اپنے دیش کے بارے میں۔

سوتردھار۔ تاریخی ڈرامے میں تو دقت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ خان صاحب اور لالہ جی کی دوستی کا ناٹک کریں۔

نٹی۔ اچھا تم ذرا دیکھنے والوں سے کچھ باتیں کرو۔ میں ایکٹروں کو جمع کرتی ہوں۔

سوتردھار۔ ایکٹروں کو جمع کروگی!

نٹی۔ جی ہاں ایکٹروں کو جمع کروں گی۔ تم تو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ میں نے کئی بار تم سے کہا ہے کہ بڑوں کے لئے ڈراما کھیلا کرو۔ مگر تم بھلا ماننے والے ہو۔ بچوں کے ڈرامے میں کتنی مصیبت ہوتی ہے۔ ایک بچے کو پکڑ کر لاؤ تو دوسرا نکل جاتا ہے۔

سوتردھار۔ اور پھر ذرا ذرا سی بات پر رونے بھی تو لگتے ہیں۔

نٹی۔ اور کیا اب انہیں مناؤ۔ ہر ڈرامے میں انھیں منانے کے لئے کھلونے اور مٹھائی پر اور روپیہ خرچ کرو۔

سوتردھار۔ اور کیا!

نٹی۔ اور کیا! — مزے میں کہتے ہو، لیکن ڈراما کروگے بچوں کا ہی۔ پنڈت نہرو نے بچوں سے محبت کیا کی، سب ہی کو شوق ہوگیا۔

سوتردھار۔ چاہے سارے دن بچوں کو پیٹیں، انہیں ننگا پھرائیں، اسکولوں میں انھیں اچھی تعلیم نہ دیں، لیکن

جلسے میں دیکھو، تقریر سنو تو گویا سارا دیس بچّوں سے پریم کرتا ہے۔

نٹی۔ خیر چھوڑو تمہیں کون سمجھائے۔ میں تو اب بچّوں کو گھیرنے جاتی ہوں۔

(نٹی چلی جاتی ہے)

سوتردھار۔ (حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے)
آپ نے ٹیگور کا نام سُنا ہے۔

ایک تماشائی۔ جی ہاں۔

سوتردھار۔ شاعرِ اعظم ٹیگور نے اپنی کتاب "گریٹر انڈیا" میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ صرف ہندوؤں کی تاریخ نہیں ہے۔ صدیوں پہلے مسلمان اپنی مذہبی اور تہذیبی میراث لے کر آئے (اس درمیان میں کچھ عورتیں آکر بیٹھ جاتی ہیں) اور یہاں کی تاریخ کا ایک حصّہ بنے۔ اب انگریز سرمایہ لے کر آئے ہیں اور اس کا جزو بن رہے ہیں۔ نیا ہندوستان کسی ایک مذہب یا نسل کے لوگوں کی جاگیر نہیں ہے۔ یہاں مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کو مل کر امن اور محبت کی زندگی بسر کرنا ہے۔

نٹی۔ ہٹ جاؤ۔ خاں صاحب کے گھر کی عورتیں آ رہی ہیں لالہ جی کے یہاں کی عورتوں سے ملنے۔

رتی اور سوتر دھار ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ لالہ جی کے گھر کی عورتیں کھڑی ہو کر استقبال کرتی ہیں۔ خاں صاحب کے یہاں کی عورتیں برقع اتارتی ہیں)

سوشیلا۔ آؤ خالدہ! آؤ۔ دو دن سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے آنکھیں پتھرا گئیں ڈیوڑھی دیکھتے دیکھتے۔

خالدہ۔ ارے کیا بتاؤں۔ دو روز سے اس سویٹر میں لگی ہوئی ہوں۔ اسی لئے نکلنا نہیں ہوا۔

سوشیلا۔ کس کا سویٹر؟

خالدہ۔ اس وقت بھی میں تو اسی کام سے آئی ہوں۔ کہاں ہیں لالہ چچا۔

لالہ جی۔ (اندر سے نکلتے ہوئے) ارے بھائی یہ کس کی آواز آرہی ہے۔ کہیں خالدہ تو نہیں؟

خالدہ کی امی۔ ہاں آپ ہی کا ذکر تھا۔ آپ کی بڑی عمر ہو۔ ابھی خالدہ آپ کو یاد کر رہی تھی۔

خالدہ۔ جی چچا! میں سوئٹر کا ناپ دیکھنے آئی ہوں۔

(خالدہ سوئٹر کے ایک ٹکڑے کو لالہ جی کے پاس آکر ناپتی ہے)

لالہ جی۔ ارے بیٹی! یہ کیا کر رہی ہو ہم روئی کی بنڈی پہننے والے ہیں۔

خالدہ۔ کل سے آپ روئی کی بنڈی نہیں پہنیں گے۔

لالہ جی کی بیوی۔ ارے جس کی بھتیجی اتنا اچھا سوئٹر بنتی ہو وہ پھر روئی کی بنڈی کیوں پہنے۔

خالدہ کی امّی۔ اور کیا! بڑے شوق سے بُن رہی ہے۔ کہہ رہی ہے
کہ اسی رنگ کا ابّا کا سوئٹر بنوں گی، تاکہ دونوں بھائیوں کے سوئٹر
ایک رنگ کے ہو جائیں۔
لالہ جی۔ اچھا یہ بات ہے۔ جیسے بیلوں کی جوڑی پر ایک ہی رنگ کی
جھول ڈالی جاتی ہے۔
خالدہ کی امی۔ بھائی صاحب! آج وہ کہہ رہے تھے —
لالہ جی کی بیوی۔ وہ کون؟ بھابی!
خالدہ کی امی۔ تمہارے بھیّا۔
(سب ہنستے ہیں)
لالہ جی۔ ہاں تو شہباز خاں کیا کہہ رہے تھے؟
خالدہ کی امی۔ کل اتوار ہے۔ نہر پر پکنک کے لئے جانا ہے۔ تیار ہو جائیے گا۔
لالہ جی۔ یہ شہباز خاں کی اتوار والی پکنک بھی خوب ہے۔ آندھی آئے،
طوفان آئے۔ اس کی پکنک کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مجھے تو کام
ہے۔ اس بار میرا جانا تو مشکل ہے۔
لالہ جی کی بیوی۔ ارے بس اپنے نخرے چھوڑو۔ بڑا کام ہے۔ اب بھیّا
تمہارے کام کی وجہ سے پکنک پر بھی اکیلے جائیں گے خالدہ کہہ دینا
بھیا سے کہ تمہارے چچا ضرور جائیں گے۔
لالہ جی۔ اچھا اگر بھیجنا ہے تو پوری ترکاری ضرور تیار کر دینا۔
لالہ جی کی بیوی۔ وہ تو ہو ہی جائے گی، مجھے خود خیال ہے۔

خالدہ ۔ آپا کو آپ کے ہاتھ کی ترکاری اتنی پسند ہے کہ جب آپ بھیج دیتی ہیں تو وہ اور کچھ کھاتے ہی نہیں ۔
خالدہ کی امی ۔ بھابی کے ہاتھ کی ترکاری تو خیر اچھی ہوتی ہی ہے لیکن سب سے مزے کی چیز تو اچار ہے ۔ ہاں ہم لوگوں نے اس ترکیب سے کتنی بار اچار ڈالا ۔ پر وہ مزا نہ آیا ۔
سوشیلا ۔ بس بس خالدہ رہنے بھی دو اتنا رائی کا پربت نہیں بناتے ۔
ننھا بچہ ۔ (توتلاتے ہوئے) اچال ہیں لائی تو پلیتی ہی ہے ۔
(سب لوگ ہنستے ہیں ۔۔۔ خالدہ بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتی ہے)
پردہ گرتا ہے

دوسرا سین

(پردہ کھلتا ہے ۔۔۔ لالہ تیج رام کا گھر ہے)
لالہ تیج رام ۔ ارے سوشیلا ۔ وہ میرا سوئٹر نہیں ملا ۔
سوشیلا ۔ یہاں تو کہیں دکھائی نہیں دیتا ۔
لالہ تیج رام ۔ ارے تجھے کیوں ملنے لگا ۔ ارے بھئی ستنی ہو نا ۔ ذرا دیکھنا میرا سویٹر کہاں رکھا ہے ؟
لالہ جی کی بیوی ۔ اے لو ۔۔۔ وہ تو یہ سامنے پڑا ہے ۔ تمہاری آنکھیں ہیں کہ بٹن ۔ ٹھیک سے دیکھو تو ملے بھی ۔
لالہ جی ۔ اچھا لو ۔ تم تو بھاشن دینے لگیں ۔ یہاں کام سے جانا ہے ۔

(لالہ جی سوئٹر پہنتے ہیں۔ اس درمیان میں کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

لالہ جی۔ (باہر نکلتے ہوئے) ارے سنتی ہو، میں آج ذرا دیر سے لوٹوں گا۔ ارے میر صاحب تم کہاں! مجھ سے کچھ کام ہے؟ اس وقت کہاں نکل پڑے۔

میر صاحب۔ ارے لالہ جی! کیا بتاؤں۔ تمہارے لنگوٹیا یار شہباز خاں سے ٹھن گئی ہے اس کو بھیک نہ منگوادی تو میرا نام بھی میر فراست علی نہیں ہے۔ بڑا پٹھان بنا پھرتا ہے۔

لالہ جی۔ ارے بھئی چھوڑو اس جھگڑے کو آپس کے تعلقات کو ٹھیک کرلو۔

میر صاحب۔ اب تو معاملہ عدالت میں طے ہوگا۔ کہہ دینا شہباز خاں سے۔

لالہ جی۔ ارے بھائی، شہباز خاں سے ہمارے بڑے گہرے تعلقات ہیں وہ آدمی بڑا شریف ہے۔ تم بلاوجہ اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔

میر صاحب۔ یہ تو میں ہی کیا سارا محلہ جانتا ہے کہ آپ کے اس سے بڑے گہرے تعلقات ہیں اور شہباز خاں نے آپ کو شیشے میں اتار لیا ہے اور لالہ جی ٹھہرے سیدھے سادے آدمی، اس کی گھات سے واقف نہیں۔ اب یہ حافظ جی آرہے ہیں۔ ان سے پوچھ لیجئے۔

(حافظ جی داخل ہوتے ہیں)

حافظ جی۔ کیا بات ہے؟ لالہ جی بڑا زوردار سویٹر نکالا ہے۔

لالہ جی۔ ارے بھائی۔ وہ ہماری بچی خالدہ ہے نا۔ شہباز خاں کی لڑکی۔ اسی نے بُنا ہے بچی کا شوق ہے اور اس کی ضد ہے کہ قمیص کے اوپر

پہنوں۔ اب تم جانتے ہو بچوں کی ضد تو رکھنا ہی پڑتی ہے۔
حافظ جی۔ ہاں کیوں نہیں لیکن میر صاحب سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟
میر صاحب۔ حافظ صاحب، سچ سچ کہنا کہ شہباز خاں کیسا آدمی ہے؟
حافظ صاحب۔ بھائی میں تم دونوں کے معاملہ میں نہیں پڑنا چاہتا۔
لالہ جی۔ بھئی میر صاحب! میں شہباز خاں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔
میر صاحب۔ ہاں ہاں کیوں سننے لگے۔ وہ بھی تمہارے خلاف کب سنتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پان والے سے تمہارے بارے میں کہہ رہا تھا۔ —
لالہ جی۔ پان والے سے کہہ رہا تھا! کیا کہہ رہا تھا؟
میر صاحب۔ اب چھوڑو بھی۔ تمہارا دوست ٹھہرا۔ تمہارے بارے میں جو جی چاہے کہے۔
لالہ جی۔ تمہیں بتانا پڑے گا میر صاحب!
حافظ جی۔ اڑاں چھوڑو۔ تم جاؤ اپنے کام پر لالہ جی۔
لالہ جی۔ نہیں میں سننا چاہتا ہوں، کیا کہتے ہیں شہباز خاں۔
میر صاحب۔ بتا دوں — وہ — وہ کہتا ہے کہ — لالہ جی! تم ہی ہو، جو برداشت کرتے ہو، ہم تو ایک دن میں مزا چکھا دیں۔

لالہ جی۔ ارے بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھاؤ گے۔

میر صاحب ۔ وہ کہتا ہے کہ لالہ تیج رام کے گھر کا آدھا خرچ میں
برداشت کرتا ہوں ۔

لالہ جی ۔ میرے گھر کا خرچ ۔

میر صاحب ۔ اور کیا ۔ اس کے تعلقات میرے گھر سے ہیں، میرے
یہاں سے عورتیں اس کے گھر جاتی ہیں میں ان کے گھر میں اچار
کے گھڑے بھجواتا ہوں ۔ اور میں سوبٹر ـــــ خیر چھوڑو بھی مجھے کیا
پڑی ہے کہ تمہارے معاملات میں دخل دوں ۔

لالہ جی ۔ ارے یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

میر صاحب ۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔ یاد رکھو زیادہ میٹھے میں کیڑے
پڑتے ہیں اور پھر وہ آدمی اچھا نہیں ۔

لالہ جی ۔ مجھے شہباز خاں سے یہ امید نہ تھی ۔ میں نے ہمیشہ اس کے
ساتھ بھائی جیسا سلوک کیا ہے ۔

میر صاحب ۔ یہی تو کہتا ہوں لالہ! تم گائے ہو گائے ـــ ورنہ مجال
ہے کہ وہ کسی اور کو کوئی بات کہہ کر نکل جائے اور یہ بھی ہماری
بیوقوفی ہے جو کہہ دیا ہے ۔ ورنہ محلے میں کسے دلچسپی ہے جو تم سے
کہنے جائے گا اور پھر تم بھی کیوں یقین کرنے لگے ۔

لالہ جی ۔ اگر بات سچی ہوگی تو کیسے یقین نہ کروں گا ۔

میر صاحب ۔ لالہ جی! تمہارا چپ رہنا ہی تو ہمارے حق میں زہر کا کام
کرتا ہے ۔ تم بولتے نہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاں گڑھا ہوتا

ہے وہیں پانی مرتا ہے۔
لالہ جی۔ مجھے آج بہت دکھ ہوا۔ میں شہباز خاں کو ایسا دشٹ آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ اب حافظ جی! تم ہی کہو۔ برسوں کا ساتھ ہے۔ تم نے کبھی ہماری زبان سے شہباز خاں کے خلاف ایک لفظ بھی سُنا۔
حافظ جی۔ لالہ جی! مجھے اسی لئے تو اور بھی حیرت ہے۔ اس محلّے میں آپ کی اور خاں صاحب کی دوستی تو ایک مثال ہے۔
میر صاحب۔ ارے حافظ جی، آپ کو کیا خبر — شہباز خاں تو مل کر گلا کاٹنے والوں میں سے ہے۔
لالہ جی۔ تو بھائی میں آج کہیں نہیں جاؤں گا۔
(لالہ جی گھر کے اندر چلے جاتے ہیں)
میر صاحب۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) اب معلوم ہوگا شہباز خاں کو — وہ ابھی میر فراست علی کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں۔
حافظ جی۔ میر صاحب! ذرا میں جلدی میں ہوں۔ پھر ملوں گا۔
پردہ گرتا ہے

تیسرا سین

(پردہ کھلتا ہے۔ لالہ جی کے گھر کا منظر — لالہ جی غصّے میں ٹہل رہے ہیں۔ چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ گھر میں سناٹا ہے)

لالہ جی کی بیوی۔ ارے کیا بات ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟
لالہ جی۔ کچھ نہیں!
لالہ جی کی بیوی۔ تم تو کام سے جا رہے تھے۔
لالہ جی۔ آج نہیں جاؤں گا۔
لالہ جی کی بیوی۔ کیا بات ہے، کچھ طبیعت خراب ہے؟
لالہ جی۔ ہاں خراب ہی سمجھو (کچھ ٹھہر کر) سو شیلا کی ماں۔ بڑے دُکھ کی بات ہے کیا بتاؤں۔
لالہ جی کی بیوی۔ ارے جلدی بتاؤ، تم تو اور دہلائے دے رہے ہو۔
لالہ جی۔ ارے کیا بتاؤں۔ شہباز خان نے ایسی بات کہہ دی کہ بس کچھ نہیں کہہ سکتا۔
لالہ جی کی بیوی۔ ارے کہتے بھی ہو یا یوں ہی پہیلیاں بجھاؤ گے ابھی انھوں نے کچھ کہا ہے کیا؟
لالہ جی۔ مجھ سے کیا کہے گا! مجھ سے کہتا تو میں منھ ڈھیر اکر دیتا۔ سارے محلے میں کہتا پھرتا ہے کہ لالہ جی کے گھر کا آدھا خرچ میں برداشت کرتا ہوں۔
لالہ جی کی بیوی۔ اونھوں ـــــ تو اب وہ ہمارے گھر کا خرچ بھی برداشت کریں گے۔
سوشیلا۔ اماں ـــ چاچا ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ مجھے تو کسی کی لگائی بجھائی معلوم ہوتی ہے۔

لالہ جی۔ بس تو چپ رہ۔ ہم نے تو اپنے کان سے سنا ہے۔ میں نے بھی اسے محلّے بھر میں ذلیل نہ کیا تو میرا نام بھی تیج رام نہیں۔

(دروازے پر کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

ارے بھائی آیا۔ ذرا دیکھنا تو باہر کون ہے۔ کہیں پنڈت جی تو نہیں آگئے۔ صبح آنے والے تھے۔

(سوشیلا سر جھکائے جاتی ہے)

سوشیلا۔ (باہر سے آتی ہے) ہاں پنڈت جی ہی آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر وقت ہو تو آج ہولی کے چندے کے سلسلے میں دو چار جگہ ہو لیں۔

لالہ جی۔ اچھا بھئی ـــــ یہ ہولی کمیٹی کا سکریٹری ہونا بھی مصیبت ہو گیا۔ پانچ سال سے کہہ رہا ہوں کہ کسی دوسرے کو چن لو۔ مگر لوگ مانتے ہی نہیں۔

(لالہ جی باہر آتے ہیں)

پنڈت جی۔ لالہ رام رام۔ بھئی اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ذرا دو چار آدمیوں سے مل لیں۔

لالہ جی۔ ہاں ہاں ضرور ـــــ تم اچھا ہوا آگئے ـــــ تم سے کچھ بات بھی کرنا ہے۔

پنڈت جی۔ لالہ جی۔ تم ذرا دیر ٹھہرو۔ میں اتنے میں خان صاحب کو بلا لاؤں پھر تینوں ساتھ چلیں گے۔

لالہ جی - خاں صاحب کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں - ان کے بغیر
کوئی کام نہیں رُکتا - بڑا آیا سیٹھ ساہوکار کہیں کا - میرے گھر کا
خرچ برداشت کرتا ہے - اس کو مزا نہ چکھا دوں تو لالہ شیو رام
کی اولاد نہیں -
کیا بات ہو گئی، لالہ جی (پنڈت جی کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے)
چلو ابھی سب بتائے دیتا ہوں -

پردہ گرتا ہے

چوتھا سین

(پردہ اٹھتا ہے - اسٹیج پر لکڑیوں کا ڈھیر ہے - سوتردھار گھبرایا ہوا آتا ہے)
سوتردھار - یہ نٹی کہاں گئی - نٹی نٹی - ارے کبھی سنتی ہو -
نٹی - (دوڑتی ہوئی آتی ہے) کیا بات ہے کیوں پریشان ہو - مجھے بھی
پریشان کرتے ہو - تمہاری چیخ سن کر میک اپ روم سے
آرہی ہوں -
سوتردھار - گڑبڑ ہو گیا - سارا کھیل گڑبڑ ہو گیا -
نٹی - کیا بات ہے - کیا کوئی ایکٹر ناراض ہو کر چلا گیا -
سوتردھار - اجی نہیں ـــــ ایکٹر ناراض ہو کر کیا جائے گا - یہاں تو بنا
بنایا تماشا خراب ہو گیا - تم سے کہا تھا کہ قومی یکجہتی کا ڈراما
کرو مگر تم ٹھہریں پنڈت نہرو کی چیلی -

نٹی۔ آخر کیا بات ہوئی؟

سوتردھار۔ تمہیں پتہ ہی نہیں — کھیل کی فکر ہو تو معلوم بھی ہو۔

نٹی۔ بات بنانے نہیں۔ اپنی لگائے ہوئے ہو۔

سوتردھار۔ کچھ سنا بھی تم نے۔ لالہ جی اور خاں صاحب میں بڑے زور کا جھگڑا ہوا اور یہی ہمارے اصل ایکٹر ہیں۔

نٹی۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔

سوتردھار۔ ابھی تو نہیں ہوا، لیکن اب ہو جاؤں گا۔ شہباز خاں نے لالہ جی کو کچھ کہہ دیا۔ اس پر انہوں نے نہ صرف یہ کہ انہیں ہولی کمیٹی سے الگ کر دیا بلکہ اس سال ہولی کا چندا بھی نہیں لیا۔

(اس درمیان میں اسٹیج کے پیچھے داہنے کونے سے شہباز خاں کی گھر کی عورتیں برقع پہن کر خاموشی سے آہستہ آہستہ گزرتی ہیں اور بائیں راستے سے لالہ جی کے گھر کی عورتیں اسی خاموشی کے ساتھ داہنے راستے کی طرف چلی جاتی ہیں۔ بیچ اسٹیج پر دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر منھ پھیر کر چلی جاتی ہیں)

نٹی۔ ارے یہ کہاں جا رہی ہیں؟

سوتردھار۔ جاتی کہاں — یہی تو کہہ رہا ہوں کہ ان کے تعلقات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ عورتوں نے بھی ایک دوسرے سے بات چیت بند کر دی ہے۔

نٹی۔ (سر پیٹ کر) میں کہتی ہوں تم کوئی دوسرا کام کرو۔ یہ ناٹک

تمہارے بس کا روگ نہیں ـــ بس تم مونگ پھلی بیچو ۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتے ۔ یہ ناٹک ہے ناٹک ۔ اچھا اب اسٹیج چھوڑو ۔
(سوزر دھار کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو نٹی کان پکڑ کر پردے کے پاس لیجا کر بٹھا دیتی ہے اور اس کے ہاتھ میں رسّی دے دیتی ہے ۔)
اب چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو ۔ ہلنا مت یہاں سے اور ایسے بیٹھو کہ تماشا دیکھنے والے تمہیں نہ دیکھ سکیں ۔
(نٹی چلی جاتی ہے اور فوراً ہی اسٹیج پر لوگ چیختے ہوئے آتے ہیں ۔ سب کے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ہیں اور چلّا رہے ہیں ـــ "ہولی ہے ـــ ہولی ہے" اتنے میں میر صاحب اور لالہ تیج رام داخل ہوتے ہیں ۔)
میر صاحب ۔ ہاں بھئی لالہ! ہولی جلانے کا کیا سمے طے ہوا ہے ۔
لالہ جی ۔ بس اب آگ دینے ہیں ـــ کیوں میر صاحب دیکھا تم نے، کیسا خاں صاحب کو چیت کر دیا، یاد کرے گا ۔
میر صاحب ۔ لالہ جی! کمال کیا ہے ۔ سنا ہے کہ مرزا صاحب کے سامنے رو گا رہے تھے کہ مجھ سے ہولی کا چندا نہیں لیا گیا ۔
لالہ جی ۔ چلو اس بہانے ان کے آٹھ آنے بچے (لالہ ہنستے ہیں)
میر صاحب ۔ اور تم کو خوب گالیاں دے رہے تھے ۔
لالہ جی ۔ میر صاحب! تم کو معلوم نہیں ۔ ان کے چندے کے لئے میرے اوپر کتنا زور پڑا ہے ۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ جب تک لالہ تیج رام سکریٹری ہیں ہولی کا چندہ شہباز خاں سے نہیں لیا جائے گا ۔

اگر پیسہ کم پڑا تو میں اپنی جیب سے دوں گا۔

ممبر صاحب۔ اس سے چندہ لینے کے لئے کس نے زور دیا؟

لالہ جی۔ ارے یہی محمود میاں، ٹھاکر گوبند سنگھ، پنڈت رام سرن ۔
غرض اس زمانے میں شہباز خاں کے بہت سے حمایتی نکل آئے۔ کہتے تھے کہ باپ دادا سے ہوتا آیا ہے کہ تیوہار میں محلے کا ہر آدمی شریک ہوتا ہے۔ شہباز خاں کو الگ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ (شہباز خاں غصے میں بپھرے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

شہباز خاں۔ ہولی نہیں جلے گی۔

ایک آدمی۔ کیوں خاں صاحب کیا بات ہے؟

شہباز خاں۔ بات مجھ سے پوچھتے ہو۔ تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے لالہ تیج رام سے پوچھو۔

حافظ جی۔ ارے خاں صاحب بات تو بتاؤ۔

شہباز خاں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ محلّے کی ہولی ہے یا لالہ تیج رام کے گھر کی۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ محلے کی ہولی ہے خاں صاحب۔

شہباز خاں۔ تو پھر میرا چندہ کیوں نہیں لیا گیا۔

(مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے)

اسی لئے تو ہولی نہیں جلنے دوں گا۔ پہلے یہ قصہ طے کرو۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ بھئی خاں صاحب، بات تو ٹھیک کہتے ہو۔

شہباز خاں۔ ٹھاکر صاحب! تم خود انصاف کرو۔ آج تک کبھی ایسا ہوا ہے؟

میر صاحب۔ کیسے نہیں جلے گی —— اب تک تمہارے ہی پیسے سے تو جلتی تھی —— بڑے آئے رستم کہیں کے!

(خاں صاحب غصّے میں آگے بڑھتے ہیں اور جوتا اٹھا کر میر صاحب کو مارنا ہی چاہتے ہیں کہ لالہ تیج رام شہباز خاں کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں)

لالہ جی۔ کمزور پر ہاتھ اٹھاتے ہو شہباز خاں —— مجھ سے بات کرو۔ یہ میرا معاملہ ہے، میر صاحب کا اس سے کیا سمبندھ —— ہولی جلے گی اور ضرور جلے گی۔

شہباز خاں۔ آگ ڈالو تو دیکھیں —— لالہ جی تمہارے کہنے پر اگر ہولی جلے گی تو اس کے ساتھ میری لاش بھی جلے گی۔ میرے جیتے جی تو کسی میں اتنا دم نہیں کہ اس میں چنگاری ڈال دے۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ بھائی سنو —— ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔ اس جھگڑے کا کچھ فیصلہ ہونا چاہئے۔

میر صاحب۔ اس کا فیصلہ یہ ہو گا کہ خاں صاحب اپنی اُپلی سے اپنے گھر میں ہولی جلائیں۔ محلے کی ہولی تو ابھی جلے گی۔

حافظ جی۔ جی اور کیا ــــ ایک آدمی کے چندا نہ دینے سے بھلا کہیں ہولی کی ساعت ٹالی جائے گی۔
میر صاحب۔ اور کیا ــــ لالہ جی تم ہولی جلاؤ۔
شہباز خاں۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں کیسے جلاتے ہو۔
ٹھاکر گوبند سنگھ۔ تھوڑی دیر کے لئے سب خاموش ہو جاؤ۔ میں ایک بات پوچھتا ہوں کہ لالہ تیج رام اور شہباز خاں کے آپسی جھگڑے سے محلے کی ہولی کا کیا تعلق ہے؟
میر صاحب۔ جی ہاں تعلق ہے۔ لالہ تیج رام ہولی کمیٹی کے سکریٹری ہیں۔
شہباز خاں۔ سکریٹری ہیں تو اٹھنی لیں۔
(جیب سے اٹھنی نکالتے ہیں)
میر صاحب۔ تو ڈال دو اپنی اٹھنی ہولی کی آگ میں۔
(شہباز خاں اک دم گھبرا جاتے ہیں)
شہباز خاں۔ میرا مطلب ہے کہ اس اٹھنی کی لکڑی لاؤ۔
پنڈت رام سرن۔ ہاں بھئی اس کی ایک اور شکل ہے کہ شہباز خاں اپنی اٹھنی کے بجائے لکڑی کا انتظام کریں۔
محمود میاں۔ لیکن اتنی رات گئے لکڑی کہاں ملے گی۔

میر صاحب۔ ملے چاہے نہ ملے لیکن اٹھنی تو نہیں جلے گی۔

(شہباز خاں چپ چاپ سر جھکائے چلے جاتے ہیں آواز آتی ہے
—— ہولی ہے! ہولی ہے!)

ایک آدمی۔ شہباز خاں کہاں گئے ہیں؟

دوسرا آدمی۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔ سونے گئے ہیں۔

میر صاحب۔ بڑے پٹھان بنتے ہیں۔

لالہ تیج رام۔ میر صاحب! ابھی خاں صاحب لالہ تیج رام کی گھاتوں سے واقف نہیں ہیں دیکھا کیسی تخنی دی ہے۔

میر صاحب۔ ہاں بھائی لالہ جی! ہم بھی تمہارے قائل ہوگئے۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ اب یہ سوچو، کرنا کیا چاہیئے۔

میر صاحب۔ کرنا کیا ہے، ہولی میں آگ دینا چاہیئے۔

پنڈت رام سرن۔ مگر یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ ہاں پنڈت جی۔ اس ہولی میں بغیر شہباز خاں کے کیا مزا۔

ایک لڑکا۔ ٹھاکر صاحب! کیا خاں صاحب اس بار رنگ بھی نہ کھیلیں گے؟

(میر صاحب لڑکے کے چپت لگاتے ہیں)

میر صاحب۔ بس بس چپ رہ بڑا آیا ہولی کھیلنے والا۔

(سہم کر لڑکا پیچھے ہٹ جاتا ہے)

لالہ جی - ہاں تو میر صاحب اب کیا کرنا چاہیئے۔
میر صاحب - کرنا کیا ہے - اب دیر ہی کس بات کی - آگ کا
انتظام کرو -
(شہباز خاں اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں - سر پر لکڑی کا بوجھ ہے جس
میں دروازوں کی توڑی ہوئی جوڑی ہے - کرسیاں اور میز کے
ٹکڑے ہیں ــــ گھریلو استعمال کا لکڑی کا سامان -)
ٹھاکر گوبند سنگھ - ارے یہ کیا ــــ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ خاں صاحب
گھر کا سامان توڑ کر لا رہے ہیں -
لالہ جی - ارے یہ تو نئی کرسیاں توڑ لائے -
پنڈت جی - دروازے کی جوڑی بھی تو ہے -
لالہ جی - (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں پونچھتے ہیں) ارے اس میں تو
خالدہ کا جھولا بھی ہے ــــ (بھرائی ہوئی آواز میں) یہ کیا کیا
تم نے !
(شہباز خاں اس گٹھری کو ہولی کی لکڑیوں میں ڈال دیتے ہیں)
شہباز خاں - (لالہ جی کے ہاتھ میں ماچس دیتے ہوئے) لالہ ! اب جلاؤ
ہولی - میرا چندہ ادا ہو گیا -
(لالہ نیج رام کے ہاتھ سے ماچس گر پڑتی ہے - شہباز خاں مونچھوں پر
تاؤ دیتے ہیں ــــ محلے کا بوڑھا حلوائی لٹھیا ٹیکتا ہوا آتا ہے)
بوڑھا حلوائی - بس ہو چکا جھگڑا - اب ہاتھ ملاؤ - آپس کی

لڑائی اچھی نہیں۔ (دونوں کا ہاتھ ملا دینا ہے ——
دونوں گلے ملتے ہیں اور رونے لگتے ہیں) میر صاحب!
تم بھی آجاؤ —— اور آج تک کے تمام جھگڑے اور
کپٹ ہولی کی آگ میں جلاؤ۔
(میر صاحب خاں صاحب سے گلے ملتے ہیں —— تالیوں کی
آواز "ہولی ہے" —— "ہولی ہے" کا شور)

پردہ گرتا ہے

پانچواں سین

(لالہ جی اور شہباز خاں کے گھر کی عورتیں ایک دوسرے سے
گلے مل رہی ہیں۔ خالدہ اور سوشیلا ایک دوسرے کے آنسو
پونچھتی ہیں لالہ جی دروازے سے باہر نکلتے ہیں کہ ٹھاکر گوبند سنگھ
ملتے ہیں)

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ ارے لالہ جی! بڑا رنگین سوئٹر نکالا ہے
اور وہ بھی اس گرمی میں۔

لالہ جی۔ ارے بھائی، وہ میری بھتیجی ہے نا خالدہ ——
اسی نے بنا ہے کہتی ہے آج تو پہنو چاہے کل اتار دینا ——
تم جانتے ہو کہ بچوں کی ضد تو رکھنا ہی پڑتی ہے۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ اور کیا ـــــ بچوں کا معاملہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

لالہ جی۔ ٹھاکر صاحب! آج ہم لوگ پکنک پر جارہے ہیں تمہیں بھی چلنا ہوگا۔

ٹھاکر گوبند سنگھ۔ ارے بھائی۔ میں کہاں پکنک پر جاؤں گا۔ مجھے اتنی فرصت کہاں۔

لالہ جی۔ آج تو تمہیں چلنا ہی ہوگا۔

(گھر میں آواز دیتے ہیں)

ارے سوشیلا کی ماں ذرا کھانا جلدی تیار کر دینا۔ پکنک پر جانا ہے اور اچار رکھنا نہ بھولنا۔ میں ابھی شہباز کے پاس سے ہوکر آتا ہوں۔

(شہباز خاں بھی آجاتے ہیں اسی رنگ کا سوئٹر پہنے ہوئے)

لو میں تو تمہارے یہاں جا رہا تھا اور تم یہاں چلے آئے۔

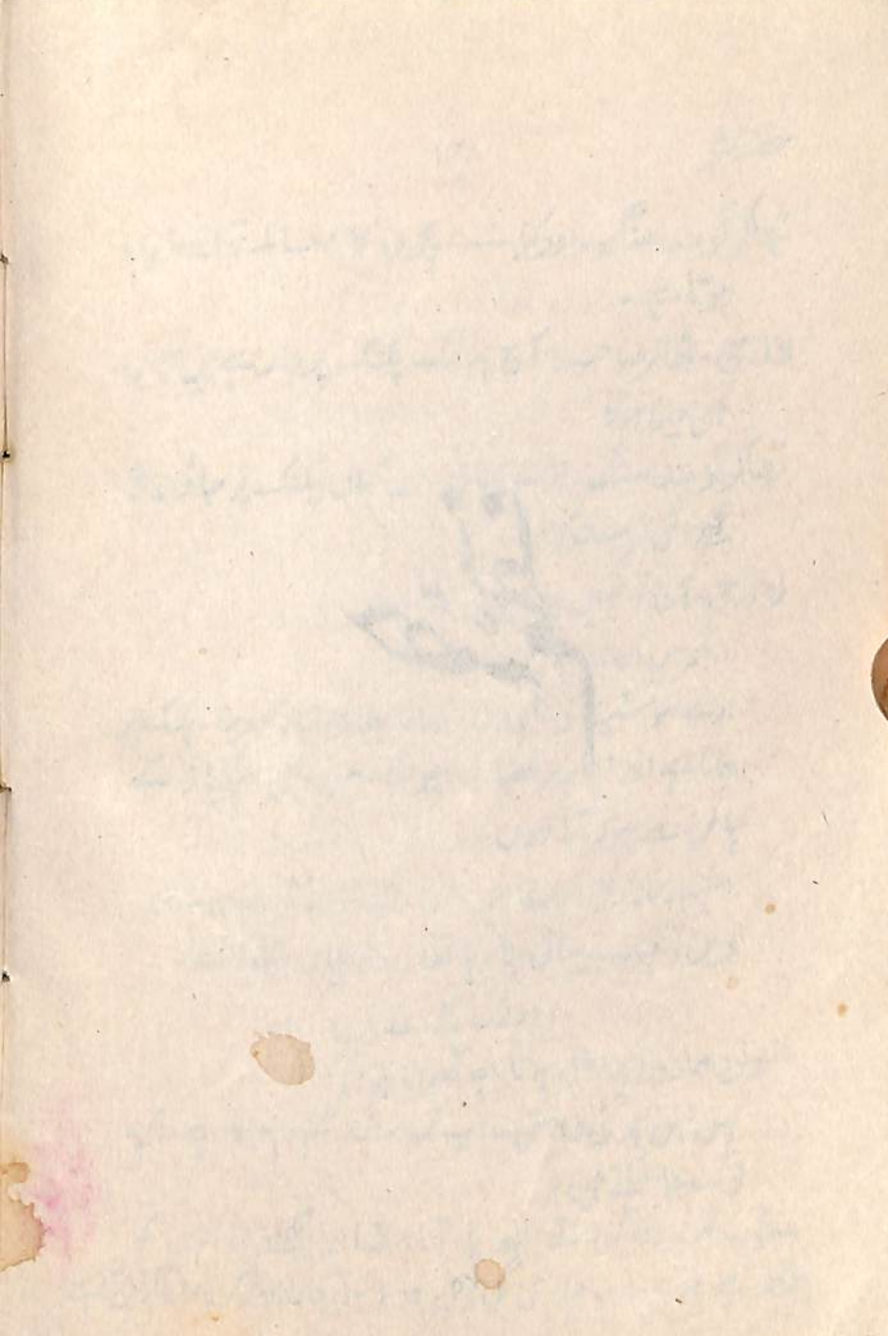
(دونوں گلے ملتے ہیں)

سوتردھار۔ (داخل ہوتا ہے گھبرایا ہوا)

بس بس ہوگئی دوستی۔ اب تماشا ختم ہونا ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

منشی۔ تم پردہ گراتے ہو یا تماشا دیکھنے والوں کو بھگا رہے ہو ـــــ جلدی گراؤ پردہ (سوتردھار دوڑکر پردہ گرا دیتا ہے)

حصۂ نظم



میر تقی میر

میر محمد تقی نام ۔ میر تخلص تھا ۔ آپ کے والد میر محمد علی شرفائے اکبرآباد میں سے تھے ۔ میر بمقام آگرہ ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے ۔ دس سال کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا ۔ اس کے بعد آپ دہلی چلے آئے ۔ یہاں پر آپ نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس پرورش پائی ۔ ابتدا میں اشعار کی اصلاح خان آرزو ہی سے لیتے تھے ۔

دہلی کی تباہی سے میر بھی پریشان حال ہو گئے تھے ۔ مگر ثابت قدمی سے جمے بیٹھے رہے ۔ آخر وہ زمانہ بھی آ گیا کہ ناچار وطن کو خیرباد کہنا پڑا ۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ اور از راہِ قدردانی تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ۔ مولوی محمد حسین آزاد آبحیات میں رقمطراز ہیں کہ جب میر صاحب لکھنؤ پہنچے تو ایک سرائے میں قیام کیا ۔ اس دن کہیں مشاعرہ تھا ۔ میر بھی وہاں پہنچ گئے ۔ ان کی قدیمانہ وضع دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے ۔ میر تنگ دل ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے ۔ جب شمع ان کے سامنے آئی تو بعض اصحاب نے پوچھا ۔ حضور کا وطن کہاں ہے ؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل میں شامل کیا ۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو معلوم ہوا ۔ بہت معذرت کی ۔ اور میر صاحب سے عفو تقصیر

جا ہی۔ میر صاحب ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی :

"واویلا مُرد شہِ شاعران"

میر صاحب میانہ قد۔ لاغر اندام اور گندمی رنگ کے آدمی تھے۔ ہر کام متانت اور شائستگی کے ساتھ کرتے تھے۔ عادات و اطوار متین اور سنجیدہ تھے۔ نہایت مہذب۔ زندہ دل۔ یار باش اور وصف دار آدمی تھے۔ آپ کے مزاج میں انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ عمدہ اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔

میر صاحب کی تصانیف میں چھ دیوان ہیں۔ ان میں جملہ اصناف سخن مثلاً قصائد۔ مثنویات۔ مراثی اور غزلیات شامل ہیں، واسوخت بھی آپ ہی کا ایجاد کردہ ہے۔

میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔ اردو میں جس قدر بڑے بڑے شعراء میر کے بعد ہوئے۔ ان سب نے میر کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ ناسخ فرماتے ہیں : ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب بھی ناسخ کے ہم زبان ہیں ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب :: کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اسی طرح استاد ذوق فرماتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر صاحب کی زندگی غم و یاس کا ایک مرقع ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں حیرت و ناکامی کا عنصر غالب ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر میر کی شاعری میں ان کی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے رنگ تغزل کو

نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ برتا۔ میر کی شاعری کا جوہر پُرتاثیر ہے۔ جو اُن کی بیشتر غزلوں سے نمایاں ہے۔ میر کے بیشتر شعر بہت ہی مشہور ہیں جس سے مُراد ان کے پُرتاثیر اشعار ہیں۔ میر کے بہت سے اشعار نہایت ادنیٰ درجے کے ہیں۔ مگر جو اچھے ہیں وہ بہت ہی اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ اسی بنا پر اُردو ناقدین کے نزدیک میر صاحب کی شاعری کی سب سے بڑی خامی ان کی ناہمواری اور شتر گربگی ہے۔

یوں تو میر صاحب نے مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں اُن کا پایہ ہر شاعر سے ممتاز ہے جس کا اعتراف اردو کے مسلّم الثبوت اساتذہ مختلف اوقات میں کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تغزّل جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے میر صاحب نے نبھایا ہے وہ ان ہی کے حصّے کی بات ہو گئی ہے۔ اور یہی چیز ہے جس کی بدولت ان کی انفرادیت قائم و برتر ہے۔

میر کے یہاں بقول مصنّف کاشف الحقائق: سوز و گداز، خستگی، نشتریت رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی وغیرہ کیفیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اور ان خصوصیات کی کثرت ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کا خلوص بھی شامل کر لیجیے تو آسانی سے یہ راز معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقابلہ تاثیر و تغزّل میں کوئی دوسرا کیوں نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ ایک اور زبردست خوبی یہ ہے کہ وہ عشق کی واردات کو اس حُسن سے بیان کرتے ہیں کہ لوگ آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ پاتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

غزلیات

میر تقی میر

(۱)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(۲)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بلب نہیں آتا



(۳)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حُسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

میر رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ جیتا، یاں بہت دن کم رہا

(۴)

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
رات گذرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

بُرقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

(۵)

میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

یک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز کی تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں سب سحر بیانی اس کی

اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرورِ خوبی
منتیں اس نے بہت کیں پہ نہ مانی اس کی

سرگزشت آپ ہی کس اندوہ سے سب کہتا تھا ۔ سو گئے تم نہ سُنی ہائے کہانی اس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو ۔ شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے ۔ دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی
اب گئے اس کے بجز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

خواجہ حیدر علی آتش

حیدر علی بمقام فیض آباد معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں سایۂ پدری سے محروم ہو جانے کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ مزاج میں شوریدہ سری اور بانکپن تھا۔ چنانچہ جب آپ لکھنؤ آئے تو شاعری کا چسکا لگ گیا۔ اس زمانہ میں انشا اور مصحفی کے درمیان نوک جھونک چل رہی تھی۔ آپ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں استاد بن گئے اور استاد کے ہم پلہ ہو گئے۔ لکھنؤ کی حالت بگڑ گئی اور آپ کی طبیعت فقر و فاقہ کی زندگی کی طرف مائل ہو گئی۔ باقی عمر توکل اور قناعت پر گذاری چنانچہ آپ کے اشعار اس کے آئینہ دار ہیں۔ اور ان سے آپ کی قلندرانہ زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ نیز آپ کے اشعار تصوف کے رنگ میں رنگے ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

آتش اردو زبان اور خاص کر غزل کے بڑے محسن ہیں۔ آپ کے زمانہ میں لکھنؤ کی شاعری کا عام مذاق صنائع بدائع یا تصنع کی طرف مائل تھا۔ آتش نے حتی الوسع اپنے آپ کو اس سے بچایا اور غزلیات میں بجائے خارجی کے داخلی کیفیات سوز و گداز اور اثر کو جگہ دی۔ جس کا ثبوت آپ کے اکثر اشعار ہیں آپ کی شاعری میں محض معشوق کے خط و خال کا ذکر نہیں جیسا کہ اس زمانے میں لکھنوی شاعری کا عام رنگ تھا۔ بلکہ قلبی واردات کا بھی بیان ہے کہیں کہیں خشک اور بے موقع قواعد کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور

بہ اگر دیکھا جائے تو آپ کا کلام زبان کی صفائی اور بندش کی چستی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ آپ نے اردو زبان کو خس و خاشاک سے پاک کیا۔ آتش کے ہمعصر استاد ناسخ تھے مثل مصحفی اور انشاؔ ر کے ناسخ اور آتش کے درمیان نوک جھونک رہتی تھی۔ اگر سچ پوچھا جائے تو اس کا اثر اردو زبان پر اچھا پڑا۔ اور اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ناسخ بمقابلہ آتش کے شاعری کے میدان میں پیچھے ہیں۔ ان کے اشعار میں اخلاقی مضامین کی کثرت ملتی ہے اور جب عشق و حُسن کے موضوع پر شعر کہتے ہیں تو عشق کے تمام اسرار کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے کلام میں حُسن کا اثر نہایت نازک اور لطیف پیرایہ میں پایا جاتا ہے۔

آپ کا کلام موتی کی طرح صاف اور سلیس ہونے کے علاوہ عام فہم ہے جس نے آپ کے خارجی مضامین کو دلچسپ اور پُر لطف بنا دیا ہے آپ نے صرف غزل کے میدان میں ہی پرواز کی ہے اور اپنی شیریں زبان سے غزل کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ محاوروں کا استعمال کرنے میں وہ روزمرّہ کی زبان کو شاعری کے قالب میں نہایت مہارت سے ڈھالتے ہیں۔ وہ عربی اور فارسی کے الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے ماحول سے تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

خواجہ حیدر علی آتش

(۱)

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی — رنجور کا انیس ہے ہمدم علیل کا
باغ و بہار آتشِ نمرود کو کیا — مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا
موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی — فرعون کو تو نے غرق کیا رودِ نیل کا
طوفاں میں ناخدائی کی کشتیٔ نوح کی — حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا

آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے
محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

(۲)

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں — سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں
نزدیک آ چکی ہے سواری بہار کی — برگِ خزاں سپیدہ گلستاں سے دور ہوں
فصلِ بہار آئی ہے کپڑوں کو پھاڑئیے — دل کے بخار دستِ گریباں سے دور ہوں
مدت کے بعد آئے ہیں صحرا میں اے جنوں — دو آبلے تو خارِ مغیلاں سے دور ہوں

گردش سے چشمِ یار کے آتش عجب نہیں
جو جو عمل کہ گردشِ دوراں سے دور ہوں

(۳)

ذہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے — کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مِٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے
تمہارے سخن کو سنیں گے جو آتشؔ
تو خوش ہوں گے سرو جہاں کیسے کیسے

(۴)

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے
منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے
عقل کر دیتی ہے انساں کی جہالت زائل
موت سے جان چھپاتے کو سپر لیتا ہے
غیرتِ نالہ و فریاد نہ کھوئے آتشؔ
آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

(۵)

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

حالاتِ زندگی

اسد اللہ خاں نام۔ غالبؔ تخلص۔ نجم الدولہ دبیر الملک خطاب، مرزا نوشہ لقب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔ آپ کے دادا نے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور شاہ عالم کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مرزا کے والد عبد اللہ بیگ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے یہاں نوکر ہو گئے اور اسکے بعد حیدر آباد میں ملازم ہوئے اور الور میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ اُس وقت مرزا کی عمر پانچ برس کی تھی۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے انکو پالا اور جب نو برس کے تھے تو چچا کا بھی انتقال ہوا۔ مرزا کو اپنے خاندان کی پنشن میں سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ ملا کرتا تھا۔

مرزا کی تعلیم ان کی والدہ نے دلائی۔ اور اُن کے کئی اُستاد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی سے بھی مرزا نے چند کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر شیخ معظم کے پاس فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ منطق، فلسفہ اور دیگر علوم کے ساتھ بھی آپکو دلچسپی تھی اور جب گیارہ برس کے ہوئے تو فارسی میں شعر کہنے لگے۔

مرزا کی شادی ۱۸۲۵ء میں ہوئی اور آگرہ چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ مرزا کی آزاد طبیعت کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ اپنے لیے کوئی مکان نہیں خریدا۔ اسی طرح مطالعہ کے لیے بھی کرایہ کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ غدر کے بعد غالبؔ کو جو پنشن انگریز سرکار کی

جانب سے ملتی تھی بند ہو گئی۔ اور بہادر شاہ ظفر کے دربار سے پچاس روپے ماہوار جو وظیفہ ملتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اس کا اثر غالبؔ کی زندگی پر بہت ہی برا پڑا۔ اور کم از کم دو سال تک مرزا معاشی بحران کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد نواب رام پور یوسف علی خاں نے ایک سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

مرزا کے یہاں سات بچے پیدا ہوئے۔ کوئی زندہ نہ رہا۔ غالبؔ کے کئی شاگرد تھے مثلاً منشی ہرگوپال تفتہؔ۔ میر مہدی مجروحؔ۔ الطاف حسین حالیؔ حالی اپنے دور کے مشہور شاعر اور ادیب بھی تھے۔ مرزا کا جوانی میں شہر کے حسین اور خوش رو نوجوانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بڑھاپے میں بھی اُن کے حسن کے آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی وہ بہت ہی کھلے دل کے تھے۔ ان کے پاس ہر مذہب اور ملت کے آدمی آیا کرتے تھے۔ محتاجوں اور غریبوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ خودداری کا یہ حال تھا کہ بغیر پالکی کے بازار نہ جاتے۔ وہ حق گو و حق پسند تھے اور بنی نوع انسان سے محبت کرنے والے ایک اعلیٰ انسان اور انسان ظریف تھے۔

مرزا نے فروری ۱۸۶۹ء میں وفات پائی اور درگاہ نظام الدینؒ میں دفن ہوئے۔ مرزا کا مقبرہ سہراب مودی نے سنگ مرمر کا بنوایا ہے۔

غالبؔ کی شاعری

(۱) غالبؔ نے اردو غزل میں فلسفہ داخل کیا حالانکہ وہ خود فلسفی نہیں تھے۔ ان کے یہاں کوئی مخصوص منطقی یا فلسفیانہ نظام نہیں۔ البتہ صوفی مشرب ہونے کی بدولت کائنات اور انسانی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی کوششیں ضرور ملتی ہیں۔ ان کے یہاں فلسفیانہ نظریات کا تصور ہے اور فلسفیانہ طریقِ فکر کے ساتھ فلسفیانہ انداز

بیان ہے جو ذہنِ انسان کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) غالبؔ کی غزل میں جذبہ کی داخلیت توانائی اور شدّت موجود ہے جذبہ اور ذہنی تصوّرات کے درمیان رشتہ قائم کرتے ہوئے خیالات کو احساسات اور مشاہدات کو ذہنی کیفیات میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس عمل اور ردّ عمل میں بھی غالب منفرد ہیں۔

(۳) غالبؔ نے اپنے دَور کے عمل اور ولولے۔ فکر و فلسفہ، حسرت و ناکامی کو اپنی غزل میں سمو کر نئی روایات کا آغاز کیا۔ اس میں حسن و عشق کے ساتھ سماجی شعور اور تہذیبی معاملات کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔

(۴) غزل میں انسانیت کی فضا پیدا کی، جتنے موضوعات غزل میں داخل کیے وہ سب انسانی زندگی کی پیداوار ہیں۔

(۵) غالبؔ کی غزل میں ذوقِ جمال زیادہ اور جنسی خواہشات کم۔ عشق میں خودداری اور خودنگری زیادہ اور غلو بہت کم۔ جذبات کی شدّت میں مصلحت۔ اور عامیانہ کے بجائے گہرائی اور فکر۔ رنگینی اور معنی آفرینی بہت زیادہ ہے۔

(۶) حالیؔ نے غالبؔ کے کلام میں جدّت پسندی۔ تشبیہات و استعارات کی نُدرت، پہلوداری اور ظرافت پر زور دیا ہے۔ اکرام نے نفسیاتی ژرف بینی کو محسوس کیا ہے۔ بجنوری نے ان کے یہاں زندگی کے سارے نغمے پائے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ غالبؔ کی غزل ان سب کا ایک حسین اور رنگین امتزاج ہے۔

(۷) غالبؔ کا کلام حسینِ الفاظ۔ حسنِ بندش اور حسنِ ترکیب کا لاجواب نمونہ ہے۔

(۸) غالبؔ کی عظمت کا راز اُن کی رنگا رنگی۔ دل کشی۔ انسان دوستی میں پوشیدہ ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور انسان بھی۔
اُن کی بذلہ سنجی۔ سنجیدہ ظرافت اُردو ادب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔
(۹) دنیا کے تمام شاعروں میں شاید چند ایسے شاعر ہوں گے جن کی شہرت کا مدار اتنے کم اشعار پر ہوگا جتنے کہ مرزا غالبؔ کے ہیں۔
(۱۰) معنی آفرینی۔ نازک خیالی اور حُسن کاری میں غالبؔ کا مقام سب سے بلند ہے۔
(۱۱) معمولی سے معمولی اور فرسودہ مضامین کو دلکش اور اچھوتا بنانے میں غالبؔ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور یہ مضامین جب مرزا باندھتے ہیں تو ان میں فرسودگی کے بجائے نیا پن ہوتا ہے۔
عشق کی حرکت، عاشق کی خودداری اور بے پناہ رشک کے ساتھ کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔
(۱۲) غالبؔ نے سب سے پہلے اردو شاعری کی قدیم کلاسیکی روایت کی تقلید چھوڑ کر اپنی شاعری میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار پر زور دیا ہے۔ اس لحاظ سے غالبؔ اردو کا پہلا رومانی شاعر ہے زبان اور بیان اور موضوعات میں ان کی انفرادیت نظر آتی ہے۔



مرزا اسد اللہ غالب

(۱)

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۲)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(۳)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گُسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۴)

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رُسوا لگے آگ اس محبّت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو

(۵)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

مولانا مولوی الطاف حسین حالؔی

حالاتِ زندگی الطاف حسین نام ۔ حالؔی تخلص ۔ شمس العلماء خطاب ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت انصاری خاندان میں پیدا ہوئے ۔ نو برس کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ۔ بڑے بھائی اور بہن کی سرپرستی میں آپ نے تعلیم حاصل کی ۔ بعد تحصیل فارسی و عربی آپ پانی پت سے دہلی چلے آئے ۔ اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے اصلاح شعر و سخن لیتے رہے آپ نے فن شعر میں غالب سے بھی فیض حاصل کیا ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شیفتہ کی صحبت نے حالی کے دماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ۔ نواب شیفتہ کی وفات کے بعد آپ لاہور آ گئے اور وہاں گورنمنٹ بکڈپو میں ترجمہ کا کام کرتے رہے ۔ چار سال لاہور میں رہے اور اینگلو عربک اسکول میں مدرس بن گئے ۔

دہلی میں ہی آپ کا سرسید سے تعلق پیدا ہو گیا تھا ۔ انکی سفارش پر گورنمنٹ سے ۷۵ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو بعد میں بڑھ کر سو روپیہ ہو گیا ۔ آپ نے اسکول ملازمت چھوڑ دی اور پانی پت ہی میں مستقل طور پر رہنے لگے اور تصنیف و تالیف کا کام کر کے زندگی گذارتے رہے ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب دیا اور ستتر برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا ۔

مولانا حالی کو بیس برس کی عمر میں شعر و شاعری کا چسکا پڑا ۔ اور انھوں نے بھی آزاد کی طرح غزل گوئی سے ابتدا کی لیکن ان کی غزلوں میں غالب و

شیفتہ کے اثر سے بڑا نکھار، تیکھاپن، گہرائی اور دل دوزی پیدا ہوگئی انکے عاشقانہ جذبات بڑے پُراثر اور نہایت تیز ہیں۔ حالی کے تغزّل میں حسن وعشق کے رموز ایسی صفائی، لطافت اور سادگی کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا خود بخود ایک پُر کیف اور پاکیزہ فضا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر اعتدال، اختصار، بے تکلفی، نرم ترنم اور کہیں کہیں سہل ممتنع نے اُن کی غزل گوئی کو اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جدید غزلوں میں البتہ اخلاقی تلقین کے باعث کہیں کہیں پھیکا پن پیدا ہوگیا ہے لیکن یہاں بھی ان کی کہنہ مشق اور اسلوب کی روانی نے بہت سے اشعار کو بے جان ہونے سے بچا لیا بحیثیت مجموعی ان کے قدیم رنگ شاعری میں دلاویزی حُسن خوبی وکمال استادی سے رچی ہوئی ہے وہ اُنہیں کا حصّہ ہے۔

لیکن حالی محض غزلگو ہی نہ تھے۔ بلکہ انکی شاعری کا اس سے بھی زیادہ اہم وہ دَور ہے جس میں وہ اصلاح قوم کے رفیع علمبردار اور تحریک جدید کے حامیوں میں ایک سرگرم رکن ہے۔

حالی کا شمار اُن چند مقتدر ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے پُرانے مدرسہ میں تعلیم پا کر ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا جواب ہماری جدید تعلیم اب تک پیدا نہیں کرسکی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب ہم مولانا حالی کے اصلاحی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کے سامنے مولانا آزاد کی بنیادی مساعی بھی ہم کو ایک حد تک بے حقیقت نظر آنے لگتی ہیں چونکہ حالی نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ جدید رنگ کی شاعری ہی کی ہو۔ بلکہ وہ جب تک زندہ رہے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ جدید شاعری کے خیال، اصول اور اس کی ضرورت کی برابر تلقین کرتے رہے۔ اس سلسلے میں قطع نظر دوسری کاوشوں کے صرف "مقدمہ

شعر و شاعری، حالی کا ایک ایسا لازوال کارنامہ ہے جس کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔

حالی کی منظومات میں سادگی، روانی، تسلسل اور ایک حد تک ہمواری یکسانیت اور یک رنگی ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ قومیت، جذبۂ ہمدردی، اخلاقی وسعت نظر اور صداقت پسندی وغیرہ کے نہایت دلکش نمونے ان نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں کہیں یہ نظمیں خشک و بے کیف ہو گئی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان میں اعلیٰ شاعری کی وجدانی کیفیات موجود ہیں۔

حالی کی شاعری کا اہم ترین دور وہ ہے جس میں انھوں نے سرسید کے زیرِ اثر قومی راگ چھیڑا اور "مسدس مد و جزر اسلام" میں معرکہ آرا نظم کی تکمیل کی۔ جو نہ صرف ایک طویل و مربوط نظم ہے۔ بلکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی ایک انوکھی چیز ہے۔ یہ درحقیقت زوالِ اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے تنزل کا مرثیہ ہے اور جس کمال کے ساتھ حالی نے اسے انجام دیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ چھپتے ہی اس درجہ مقبول ہوا کہ ہر گھر اور ہر مجلس میں بڑی شگفتگی سے پڑھا جانے لگا۔ اور آج بھی ہر پڑھے لکھے اردو داں کو اسکے دو چار بند یاد ہیں۔ اس نظم کے بعد سے حالی قومی شاعر مشہور ہوئے اور مسلمانوں کا تنزل حالی کی جدید شاعری کا ایک موضوع بن گیا۔ جو حالی کی اپنے معاصرین میں ایک نمایاں فضیلت و برتری کا احساس دلاتا ہے۔

❖ ❖ ❖

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

(۱)

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ ۔ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے ۔ نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا ۔ مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا ۔ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں ۔ یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالیؔ
الاپیں نہ بس آپ دُھرپت زیادہ

(۲)

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت ۔ پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں ۔ دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا ۔ دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
جاں نثاری پر وہ بول اٹھے مری ۔ ہیں فدائی کم، تماشائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا ۔ خاکساری اپنی کام آئی بہت
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے ۔ تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

(۳)

کہنے کی بات ہو تو اُسے کہہ سنائیے — جو دل پہ بن رہی ہو وہ کیونکر دکھائیے
دنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے — یاں کھوئیے بہت تو کچھ جا کے پائیے
یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبے میں مقام — ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگائیے
گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو — ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار جائیے
اور اعتبار رکھو تے ہو اپنا رہا سہا — بس آگیا یقین ہمیں قسمیں نہ کھائیے

ہوتی ہجوم غم میں ہے کیوں زہر کی تلاش
حالی بتائیں آپ کو گر کچھ کھلائیے

(۴)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا — گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
بنا ہے لیجئے جب نام اُس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(۵)

جہاں میں حالؔی کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا، بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی، نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُس کو، تصوّر اپنا نہ کیجئے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ، کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانے کی خو ہے نکتہ چینی، کچھ اس کی پروا نہ کیجئے گا

کمال ہے ضدِ بے کمالی، نہیں ملاپ انہیں حرف گیرو
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجئے گا تو آپ بے جا نہ کیجئے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ اُلفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجئے گا

تمہارا تھا دوستدار حالؔی اور اپنے بیگانے کا رضا جُو
سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجئے گا

حسرت موہانی

حالاتِ زندگی : سید فضل الحسن نام حسرت تخلص۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ نسیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے ایک عرصے تک رسالہ "اردوئے معلیٰ" نکالتے رہے۔ حسرت کی زندگی سیاسی ہنگاموں اور مالی دشواریوں سے دوچار رہی۔ سیاسی رُجحان کی وجہ سے آپ کو کئی بار جیل جانا پڑا۔ وہاں بھی مشقِ سخن جاری رہی۔ آپ نے کبھی انگریزوں کی نوکری نہیں کی اور پریشانی کے عالم میں کانپور میں زندگی بسر کرتے رہے۔ آپ کسی کا احسان لینا گوارا نہ کرتے تھے۔

حسرت نے غزل کو محض حسن و عشق کی واردات تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ اور جس عنوان کا خیال اُن کے دل پر اثر کرجاتا ہے اس کو وہ غزل میں جگہ دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے یہاں دوستوں کا شکوہ، احباب کا ماتم، سیاسی و مذہبی عقائد وغیرہ سب ہی کچھ پائیں گے۔ ان سب میں جہاں کہیں ملکی معاملات کا تذکرہ اعلانیہ آگیا ہے وہاں زور تو ضرور ہے مگر شعریت کی کمی تاثیر کو اُبھرنے نہیں دیتی۔ لیکن اس قسم کے اشعار بہت کم ہیں۔ حسرت اُن چند مخصوص شعرا میں ہیں جو غزلوں میں تغزّل کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان کے کلام کا امتیازی پہلو ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی وہ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ عام طور سے ملائم اور عام فہم لفظوں کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی فارسی کی ایسی ترکیبیں بھی لاتے ہیں جو بعض لوگوں کے

نزدیک پسندیدہ نہیں۔ غالباً یہ غالبؔ کی تقلید کا اثر ہوا۔ دل شدگان۔ خود فراموش، وجہِ نومیدی بسیار۔ فریادِ دستِ عشق۔ بانہزاراں آرزو وغیرہ۔ جا بجا اُن کے اشعار میں ہیں۔ جہاں کہیں کلام میں برجستگی ہے، وہ نہایت ہی لطیف و دلکش ہے۔ مومن کی طرح اکثر اشعار میں تھوڑی سی ایسی پیچیدگی پسند کرتے ہیں جو طبیعت میں الجھاؤ نہ پیدا ہونے دے بلکہ معنویت و لطف زیادہ کر دے۔

ان کا کلام نہ تو سراپا یاس و نامرادی کا مرقع ہے اور نہ عیش و نشاط کی محفل۔ اگر آپ کو اُن کے اشعار میں دکھ درد کا ذخیرہ ملے گا تو مسرت و شگفتگی بھی جا بجا نظر پڑے گی جس کی وجہ سے طبیعت اُکتا نہیں سکتی۔ ذہنیت کے لحاظ سے بھی حسرت زاہدِ خشک نہیں۔ انکے کلام میں رنگینی بھی ہے لیکن کہیں کہیں شوخی متانت کے جامہ سے باہر ہو گئی ہے۔ قدماء کی تقلید کا اثر ان کی طبیعت میں کئی لحاظ سے نمایاں ہے۔ ساقی و پیمانہ۔ شمع و پروانہ۔ گل و بلبل وغیرہ ان کے خاص موضوعِ کلام ہیں کبھی کبھی پُرانے لوگوں کی تقلید میں مسلسل غزلیں بھی کہتے تھے۔ قریب قریب ہر ردیف پر 'الف' سے لے کر 'ی' تک طبع آزمائی کی ہے۔ خواہ ایک ردیف میں ایک ہی غزل کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بعض بعض پرانے الفاظ بھی روا رکھے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً 'دیجیو'، 'آن پہنچے'، 'بارے' لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کلام الجھاؤ اور بیکار باتوں سے پاک ہے۔ صفائی تشبیہیں خاص طور پر انکے یہاں ہر جگہ موجود ہے۔ کلام میں آزادی اور آزاد خیالی و صاف گوئی نظر آتی ہے غزلوں میں تسلسل اور وحدتِ فکر کا عام رجحان نظر آتا ہے۔ زبان مستند اور طرزِ بیان سادہ اور رواں ہے۔ کلام میں بلندی اور رنگِ تغزل کی کثرت ہے۔ آپ کے یہاں غزل کی روایت کا شدید احساس ملتا ہے۔ آپ نے اردو غزل کو خیالی مینا کاری بے نتیجہ مبالغہ آرائی اور ظاہر پرستی سے آزاد رکھا ہے۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی

(۱)

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

(۲)

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
بڑھ کے نیرا خطا مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر بر پا کر دیا
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا
کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منوّر جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اُجالا کر دیا
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارا کر دیا
سب غلط کہتے تھے لُطفِ یار کو وجہِ سکون
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

(۳)

اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے
دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے
وہ حُسن کے مالک ہیں جفا ہی انھیں جائز
میں بندۂ خوباں ہوں وفا میرے لئے ہے
پاکر مجھے بےکس تری رحمت یہ پکاری
یہ بندۂ بے برگ و نوا میرے لئے ہے
اُس گیسوے پرخم کی اُڑا لائی ہے نکہت
آوارگیٔ بادِ صبا میرے لئے ہے
اوروں پہ نوازش ہے جو بیباک ہے حسرت
قسمت سے وہ مجبورِ حیا میرے لئے ہے

(۴)

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہیں پا وصفِ عزم
برینائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر
دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و شرف
بہرِ حسرتؔ موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

(۵)

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ کچھ دیجے جواب
دیکھ لیجئے اور تغافل آشنا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھکر کج ادا ہو جائیے

گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشہ دیکھئے
قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے

یاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پر جفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال
آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد — اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے
ہائے رے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر — اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ جی میں ہے
چھُٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

جگر مراد آبادی

۱۸۹۰ء میں مراد آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو شعر و شاعری کا گہوارہ تھا۔ انکے والد صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپکی قابلیت آپکے اپنے مطالعہ اور نیک صحبت کی رہین منت ہے۔ مدرسوں اور کتابوں کی بہت کم۔ آپ کو داغ اور تسلیم کا تلمذ حاصل تھا۔ آپ بڑے رنگین طبع، زندہ دل، احباب پرست اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ آپ بڑے حسن پرست اور تلاش حسن میں سرگرداں رہتے۔ برسوں عشق مجازی کی گلیوں کی خاک چھانی اور جوش و مستی سے بھرپور ترانے الاپے۔

بعد میں آپ پر حقیقت کا رنگ چڑھ گیا۔ اور عمر کے آخری حصے میں آپ اسی عشقِ حقیقی میں مست نظر آتے ہیں۔ آپکے جہانِ فکر میں افسردگی مایوسی۔ اور دل کی موت کا کہیں گذر نہیں۔ یار کی توجہ شبِ فراق میں بھی نیند بن کر ان کی آنکھوں کو پیامِ راحت بخشتی ہے۔

آپ کے کلام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ بعض اشعار کے الفاظ انکا مفہوم پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ابتدائی دور کے کلام میں واقعی یہ خامیاں تھیں۔ مگر عمر کے ساتھ ساتھ یہ خامیاں دور ہوتی گئیں اور پھر آن کا شمار بلند پایہ کے اساتذہ میں ہے۔ داغ کے بعد بہت سے لوگوں نے انکا رنگ اختیار کرنا چاہا۔ مگر وہ تقلید سے آگے نہ بڑھ سکے۔ صرف جگر ہی ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری اور زبان داغ کی سادگی کا نچوڑ ہیں آپ کی شاعری عاشقانہ ہوتے ہوئے بھی روحانیت کی جھلک لیے ہوئے ہے۔

جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ادائیگی و روانی ہے۔ وہ ثقیل الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ جو فارسی ترکیبیں کام میں لاتے ہیں وہ عموماً سبک اور دلنشیں ہوتی ہیں جس سے روانی اور لطف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ محاورات کے برمحل صرف سے اپنے کلام میں برجستگی اور ایک خاص مزہ پیدا کرنے میں جگر کو نہایت اچھا سلیقہ ہے۔ "داغِ جگر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر کو رعایتِ لفظی اور بناوٹ کا بھی کس قدر چسکا ہے۔

الفاظ کی تکرار سے وہ اپنے اشعار میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ عموماً کامیاب ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ تکرار بھدی اور کچھ زیادہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں اُن کے موجودہ کلام میں بہت کم ہو گئی ہیں۔ ان کا رجحان اب زیادہ تر مضمون و معنی کی طرف ہے۔

جگر کے بعد کے کلام میں پہلے کلام سے کافی فرق ہے۔ اور وہ کسی قدر الگ ہے" شعلۂ طور" دوسرا دیوان، "داغ جگر" سے بحیثیتِ مجموعی بہتر ہے۔ اس میں زیادہ متانت زور اور پختگی ہے تخیّل میں بھی پہلے سے زیادہ بلندی ہے۔ حقایق و معارف کے مسائل اکثر بڑی خوبی اور شدّومد سے بات میں منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ زبان میں فارسیت زیادہ آ گئی ہے۔ کہیں کہیں پورے مصرعے فارسی کے ہو گئے ہیں۔

جگر نے عمیق مضامین کی تلاش میں قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ لیکن کہیں کہیں الفاظ ان کے مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں۔ اور پُرگوئی کی وجہ سے خیالات میں تکرار آ گئی ہے۔

جگر کے کلام میں افسردگی، مایوسی اور دل کی پژمردگی کا نام و نشان نہیں ملتا۔
جگر کی غزلوں میں ترنم، موسیقی اور کلاسیکی کی آمیزش ملتی ہے۔ جذبات کی مستی حد درجہ پائی جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

علی سکندر جگرؔ مرادآبادی

(۱)

دل گیا رونقِ حیات گئی ۔ غم گیا ساری کائنات گئی

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل ۔ رائیگاں سعیٔ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن ۔ اک مسیحا نفس کی بات گئی

نہیں ملتا مزاجِ دل ہم سے ۔ غالباً دُور تک یہ بات گئی

ترکِ اُلفت بجا سہی ناصح ۔ لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی

قیدِ ہستی سے کب نجات جگرؔ
موت آئی اگر حیات گئی

(۲)

وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا ۔ اُس نے جس طرح سے چاہا مجھے برباد کیا

کیا طریقہ ہے یہ صیّاد کا اللہ اللہ ۔ ایک کو قید کیا ایک کو آزاد کیا

دل کا کیا حال کہوں جوشِ جنوں کے ہاتھوں ۔ اک گھروندا سا بنایا کبھی برباد کیا

عشق کیوں سوگ مناتا یہ خوشی کیا کم ہے ۔ دل یہ جیں کا تھا اسی نے اِسے برباد کیا

بددعا تھی کہ دعا کچھ نہیں کھلتا لیکن ۔ چپکے چپکے لبِ نازک سے کچھ ارشاد کیا

موت اک دامِ گرفتاریٔ تازہ ہے جگرؔ
یہ نہ سمجھو کہ غمِ عشق نے آزاد کیا

(۳)

نقشِ وفا کا رنگ مٹایا نہ جائیگا ۔ مل بھی گیا جو زہر تو کھایا نہ جائیگا
سر سے جنونِ عشق کا سودا نہ جائیگا ۔ تم سے جو یہ طلسم مٹایا نہ جائیگا
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغِ آرزو ۔ آنکھوں سے تو یہ راز چھپایا نہ جائیگا
مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تو نے کیا ۔ دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائیگا

ان کو بلا کے اور پشیماں ہوئے جگر
یہ کیا خبر تھی ہوش میں آیا نہ جائے گا

(۴)

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا ۔ دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا
جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ رے معراجِ شوق ۔ دیکھتا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آ ہی گیا
ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو ۔ میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں ۔ درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
ہائے کافر دل کی یہ کافر جنوں انگیزیاں ۔ تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا
دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار ۔ بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

(۵)

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر
عجب انقلابِ زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر
مری سمت سے اُسے اے صبا یہ پیام آخرِ غم سُنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر
میں رہین درد سہی مگر، مجھے اور چاہیئے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غمِ یار پر

نظیر اکبر آبادی

اصلی نام ولی محمد تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے زمانے میں دہلی چھوڑ کر آگرہ آگئے اور محلہ تاج گنج میں رہے۔ اور معلّمی کی معمولی تنخواہ پر عمر گذار دی۔ غضب کا استغنا اور قناعت تھی۔ کسی دربار سے تعلق نہ رکھا۔ عربی فارسی کے عالم اور فنِ شاعری میں ماہر اور آزاد منش انسان تھے۔ تعصب و تنگ نظری سے پاک۔ والدین کے بہت لاڈلے اور اصلی معنی میں انسان تھے۔ دنیا اور زندگی اور ان کی مختلف کیفیتوں اور قدرتی مناظر غرضیکہ ہر چیز کو دل و دماغ اور بیدار چشم سے دیکھا۔ وہ ہندو مسلمان کے یکساں دوست تھے۔ اور دونوں کے میلوں اور تقریبات اور تہواروں میں پوری دلچسپی لیتے۔

وہ عوامی آدمی تھے اور ہر خاص و عام کا یکساں احترام کرتے۔ کسی رئیس یا شاہی دربار کے دست نگر نہ ہوئے بلکہ عوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے۔ ان کی زبان بھی عوامی ہے جو اُس وقت تو حقارت سے دیکھی گئی۔ لیکن جدید اردو نظم کی سنگِ بنیاد ثابت ہو کر آج نہایت عزت سے دیکھی جاتی ہے۔ نظیر کی شاعری اپنی ایک علیحدہ دنیا رکھتی ہے جس نے میر اور سودا کی سخن طرازی دیکھی اور دبستان لکھنؤ کی جوانی کا نکھار بھی۔ نظیر نے غزلیں بھی کہیں ہیں لیکن ان کی نظمیں

بہت مقبول ہیں اور نہایت دل چسپ۔

"کلیاتِ نظیر" دراصل ایک خوش رنگ گلدستہ ہے جس میں ہر قسم کی ہر موضوع پر اور ہر عمر والوں کے لیے نہایت پُر لطف نظمیں موجود ہیں۔ کمال یہ ہے کہ زبان بھی اسی موضوع کے اعتبار سے استعمال کی ہے۔

نظیر کی کئی نظمیں تو بچوں کے لیے ہیں بچوں کی زبان میں۔ عہدِ جوانی کی چند نظموں میں تو کہیں ابتذال آ گیا ہے۔ لیکن وہ نظمیں جو تصوّف کے رنگ میں ہیں یا جہاں اخلاق کی تلقین کی ہے۔ نیز جہاں انھوں نے انجامِ عشق کی تلخیوں کی موثر تصویر کھینچی ہے۔ سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ گویا وہ اُردو کے سعدی اور انگریزی کے شکسپیئر ہیں آپ جدید اور قدیم شاعری کی درمیانی کڑی ہیں۔

آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، ہولی، عید، برسات، روضۂ تاج گنج۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔

شاعر کیا تھے چلتا پھرزہ تھے۔ راہ چلتے شعر کہتے۔ عام لوگ یہاں تک کہ فقیر اپنی صدا لگانے کے لیے ان سے شعر کہلواتے چنانچہ نظیر کو عوام کی زبان میں شاعری کرنا پڑی۔ اور اشعار ان کے جلد مقبول ہو گئے۔ لوگ ان کے کلام کو مبتذل اور صوفیانہ اور بازاری کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اس سے کون انکار کریگا کہ ان کے کلام میں اثر ہے۔ زندگی اور واقعات کی سچی تصویر کشی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے۔ ہندوستان کے حالات و رہن سہن کا آئینہ ہے اور پُر لطف و سبق آموز ہے۔

نظیر کی نظموں میں خالص ہندوستانی رنگ جھلکتا ہے اور وہ ہندوستانی عناصر کو نہایت ہی کامیابی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں درد ہے۔ واقعات کی حسین تصویر کشی اس انداز سے کرتے ہیں کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ غریبوں اور بیکسوں کا درد نظیر کے دل میں موجود ہے۔

نظیر کو شاعری کا شوق قدرتی تھا۔ آپ کے کلام میں سادگی اور سلاست کی کثرت ہے انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ قدیم شعراء نے آپ کو بازاری شاعر کہا تھا۔ لیکن آج نظیر کو عوامی اور ترقی پسند شعراء کی صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔



ولی محمد نظیر اکبر آبادی

عید الفطر

ہے عابدوں کو طاعت و تجرید کی خوشی
اور زاہدوں کو زہد کی تمہید کی خوشی
رند عاشقوں کو ہے کسی امید کی خوشی
کچھ دلبروں کے وصل کی کچھ دید کی خوشی

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

روزے کی خشکیوں سے جو ہیں زرد زرد گال
خوش ہو گئے وہ دیکھتے ہی عید کا ہلال
پوشاکیں تن میں زرد سنہری سفید گال
دل کیا کہ ہنس رہا ہے پڑا تن کا بال بال

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

پچھلے پہر سے اُٹھ کے نہانے کی دھوم ہے
شیر و شکر سیویاں پکانے کی دھوم ہے
پیر و جواں کو نعمتیں کھانے کی دھوم ہے
لڑکوں کو عیدگاہ کے جانے کی دھوم ہے

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

روزوں کی سختیوں میں نہ ہوتے اگر اسیر
تو ایسی عید کی نہ خوشی ہوتی دل پذیر
سب شاد ہیں گدا سے لگا شاہ تا وزیر
دیکھا جو ہم نے خوب تو سچ ہے میاں نظیر

ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

مکافاتِ عمل

ہے دنیا جس کا نام میاں یہ اور طرح کی بستی ہے
جو مہنگوں کو یہ مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے
یاں ہر دم جھگڑے اٹھتے ہیں ہر آن عدالت کستی ہے
گر مست کرے تو مستی ہے اور پست کرے تو پستی ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف و عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یہ سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کو ناحق میں کوئی جھوٹی بات لگاتا ہے
اور کوئی غریب اور بے چارہ حق ناحق لُٹ جاتا ہے
وہ آپ بھی لوٹا جاتا ہے اور لاٹھی پاٹھی کھاتا ہے
جو جیسا جیسا کرتا ہے پھر ویسا ویسا پاتا ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف و عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یہ سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کی جاں بخشے تو اس کی بھی حق جاں رکھے

جو اور کسی کی آن رکھے تو اس کی بھی حق آن رکھے
جو یاں کا رہنے والا ہے وہ دل میں اپنے ٹھان رکھے
یہ چرت پھرت کا نقشہ ہے اس نقشے کو پہچان رکھے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف و عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو پار اُتارے اوروں کو اُس کی بھی پار اُترنی ہے
جو غرق کرے پھر اُس کی بھی ڈبکوں ڈبکوں کرنی ہے
شمشیر تبر بندوق سناں اور نشتر تیر نہرنی ہے
یاں جیسی جیسی کرنی ہے پھر ویسی ویسی بھرنی ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف و عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کا اونچا بول کرے تو اُس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اُس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف و عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

میر انیس

میر ببر علی نام اور انیس تخلص ۔ میر خلیق کے صاحبزادے تھے ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو میر انیس بھی یہیں آرہے ۔ انیس کا خاندان سالہا سال سے زبان کی خدمت کر رہا تھا پشتوں سے شاعری سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھی ۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس قسمت آزمائی کے لیے لکھنؤ آئے اور تھوڑے ہی دنوں میں مرزا دبیر کے مدمقابل قرار دیئے گئے ۔ غدر کے بعد لکھنؤ میں قدر دان نہ رہے تھے اور جب لکھنؤ کی بساط الٹ گئی تو بنارس ۔ الہ آباد ۔ پٹنہ اور حیدر آباد بھی گئے ۔ اور غیر معمولی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ۔ میر انیس بڑے خوددار ۔ غیور ۔ پابندِ وضع صاحب کمال تھے ۔ پھر ایک ایسے اہم اور سنجیدہ موضوع پر شاعری کرتے تھے کہ لوگ انکی عزت پر مجبور تھے ۔ وہ امرا اور سلاطین کو بھی اسی لیے خاطر میں نہ لاتے تھے کہ وہ ذاکرِ امام ~~تھے~~ ۱۸۷۴ء کو لکھنؤ میں وفات پائی ۔

انیس کے دادا میر حسن تھے ۔ جن کی مثنوی سحر البیان آج تک مقبول خاص و عام ہے ۔ انیس نے جب آنکھ کھولی تو لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا بہت رواج تھا ۔ انیس نے اپنے والد کی جگہ کو پر کر لی ۔ اور مرزا دبیر کے حریف بنگئے ۔ انیس کے کلام کو بے انتہا مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی ۔ فصاحت تو انیس کے کلام پر ختم ہے ۔ مناظرِ قدرت کا بیان کرنا ہو یا انسانی جذبات اور احساسات کی تصویر

کھینچنا وہ ہمیشہ واقعیت اور اصلیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس صنف میں تمام شعرار متقدمین پر سبقت لے گئے ہیں۔ وہ الفاظ سے ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ مصوّر بھی قاصر رہ جائے۔ میرانیس کا طرزِ بیان بہت موثر ہے۔ موضوع کے لحاظ سے انکا طرزِ بیان کہیں سادہ رنگین اور کہیں پُرزور ہوتا ہے۔ لیکن کہیں بھی تصنع اور آورد نہیں ہوتا۔ انیس کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔

میرانیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے تمام فنی لوازم کو برتتے ہوئے اور عقیدے کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اعلیٰ پایہ کی ایسی نظمیں لکھیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے مرثیہ ہیں لیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے بلند پایہ رزمیہ اور اخلاقی نظموں کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ میرانیس نے قدرتِ بیان کا وہ معجزہ دکھایا ہے کہ ہر موقع اور عمل پر ذہنی اور جذباتی کیفیت کو وہ مخصوص حقیقت پسندانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ محاکات نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کی جتنی اچھی مثالیں میرانیس کے یہاں ملیں گی۔ کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے مل سکیں گی۔ انکا موضوع جتنا ارفع و اعلیٰ تھا ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔ میرانیس کی مرثیہ نگاری میں جذبات کی مصوّری، درد، نفسیات، انسانی جذبات کی منظر نگاری ملتی ہے۔ اس طرح میرانیس نے مرثیے میں اپنی فنکاری اور ہنرمندی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ کلام میں روانی، سادگی سلاست فصاحت و بلاغت ملتی ہے۔ محاکات کی تشکیل میں اس لیے انھوں نے بڑا کمال اور حسن دکھایا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

میر ببر علی انیس

حضرت حسینؑ کی جنگ کیلئے رخصت

جب بندھ چکیں صفیں، تو علم کھل گئے تمام
غل پڑ گیا کہ جنگ کو نکلے شہِ انام
حلقے میں اہلِ بیت کے روتے تھے یاں امام
لپٹی ہوئی تھی قدموں سے بانوئے نیک نام
بکھرائے سر کے بال حرم ساتھ ساتھ تھے
پٹکے میں شاہِ دیں کے سکینہ کے ہاتھ تھے

زینب بلک رہی تھی، پریشاں تھے سر کے بال
نعلین تھی نہ ہوش نہ چادر کا تھا خیال
سینہ کبود، چاک گریباں شکستہ حال
کہتی تھی مجھ پہ رحم کرو اے فاطمہؑ کے لال
پوچھے گا کون، ساتھ چھٹے گا جو آپ کا
نے ماں کا آسرا ہے مجھے اب نہ باپ کا

زینب کے اضطراب پہ شہ روئے زار زار
فرمایا اے بہن تری الفت کے میں نثار
یاد آگیا حسینؑ کو اس وقت ماں کا پیار
لیکن میں کیا کروں نہیں کچھ میرا اختیار
واللہ اپنے قول کا ہر دم خیال ہے
بھینا حسینؑ مخبرِ صادق کا لال ہے

بچپن میں جو زباں سے کہا ہے کریں گے ہم
کھائیں گے تیر ظلم لہو میں بھریں گے ہم
حلق اپنا زیرِ خنجرِ قاتل دھریں گے ہم
امت کے بخشوانے کو پیاسے مریں گے ہم

اب ہاتھ اٹھاؤ فاطمہ کے نورِ عین سے
ہوگی کبھی نہ وعدہ خلافی حسینؑ سے

یہ سُن کے گر پڑی جو قدم پر وہ نوحہ گر | لپٹا لیا بہن کو گلے سے بہ چشمِ تر
رو کر کہا کہ ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر | زینب خدا کیواسطے پیٹو نہ اپنا سر

خاصانِ حق کا خلق میں رتبہ بلند ہے
صابر رہو کہ صبر خدا کو پسند ہے

فرما کے یہ سکینہ کے منہ پر نگاہ کی | گودی میں لے لیا اسے اور دل سے آہ کی
بولی بلائیں لیکے وہ رخسار شاہ کی | سمجھی ہوں آخری یہ نگاہیں ہیں چاہ کی

رونا یہ بے سبب نہیں منہ موڑ موڑ کے
مرنے چلے ہیں آپ مجھے گھر میں چھوڑ کے

معلوم ہو گیا کہ نہ اب آئیے گا آپ | چھاتی پہ سونیوالی کو تڑپائیے گا آپ
چھوڑا اگر مجھے تو نہ اب پائیے گا آپ | میں اپنی جان دونگی اگر جائیے گا آپ

فرقت میں مجھ کو جی سے گذرنا قبول ہے
اچھا سدھارو گر مرا مرنا قبول ہے

مُنہ چوم کے یہ کہنے لگے شاہ خوش خصال | صدقے عقیق لب ترے فاطمہ کا لال
معلوم ہے حسین کو بی بی تمہارا حال | کیونکر نہ روؤں میں کہ قلق ہے مجھے کمال

ان برگِ گُل سے ہونٹوں کے صدقے امام ہو
سولہ پہر ہوئے ہیں کہ تم تشنہ کام ہو

تدبیر اک نکالی ہے آنسو نہ اب بہاؤ | ہم پانی لینے جاتے ہیں تم ماں کے پاس جاؤ

سوکھی زباں دکھا کے نہ شبیر کو رُلاؤ　　بی بی دعا کے واسطے ننھے سے ہاتھ اٹھاؤ
حق سے کہو بتول کے جانی پہ رحم کر
یا رب ہماری تشنہ دہانی پہ رحم کر

ناچار شہ کی گود سے اُتری وہ رشکِ حور　　روتے ہوئے محل سے برآمد ہوئے حضور
پھیلی زمیں پہ روشنیٔ آفتابِ نور　　پڑھنے لگے درود رفیقانِ ذی شعور
چوما ادب سے پائے امامِ انام کو
خم ہو گئے تمام نمازی سلام کو

حق کے ولی مصاحبِ سردارِ انس و جن　　کوئی جواں کوئی متوسط کوئی مُسِن
فاقوں میں جو اس لڑائی میں مطمئن　　کہتے تھے روزِ قتل ہمیں عید کا ہے دن
مانگو دعا کہ آج یہ مرنا سعید ہے
قرباں ہوں حسینؑ پہ رن میں تو عید ہے

حالی کی نظم نگاری کی خصوصیات

حالی کو نئے ادبی تقاضوں کا احساس سب سے پہلے ہوا۔ انھوں نے نظم نگاری میں وسعت اور اصلیت پر زور دیا اور حقیقت پسندی کا جوہر نمایاں کیا۔ اور شاعری میں اجتماعی شعور پیدا کیا۔ نظم کے موضوعات میں وسعت پیدا کی جس میں زندگی کے سیاسی۔ قومی، معاشرتی، تعلیمی اور سماجی پہلوؤں کو سمو دیا۔ خیال اور جذبے کو شاعری کا معیار قرار دیا سادگی اور فکری وحدت کو لازمی قرار دیا۔ نظم کی سرحدوں کو وسیع کیا۔ اس میں سماج کے عروج و زوال کی داستانیں نظم کیں ایک فرد کے بجائے قوم یا اس کے درد کا مرثیہ لکھا اور اپنی شاعری کے ذریعے قوم کی اصلاح کا کام انجام دیا۔ سادہ سلیس۔ رواں اور عام فہم زبان کو معیاری زبان قرار دیا۔ قومی، وطنی اور سماجی مسائل پر معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں اور اپنے پیغام کے لیے نئے سانچے تیار کیے۔ حالی کے یہاں احساس کی شدت اور شعور کی گہرائی حد سے زیادہ ہے جس نے تاثر پیدا کر دیا ہے۔

حالی نے اردو ادب کی کافی خدمت کی ہے اور ان کا نام قومی شاعری کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ حالی نے اپنی شاعری کے ذریعے جو پیغام دیا ہے وہ اردو ادب کے لیے بڑے فخر کا باعث ہے انکا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ حالی نے عورتوں کے مسائل کو بھی اپنے کلام میں کافی جگہ دی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

ظہورِ رحمت

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت　　بڑھا جانبِ بُو قبیس ابرِ رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دُعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانیوالا　　مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے در گذر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حِرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر　　تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور　　سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے تو سُن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانیوالا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنیوالا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اِک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوئی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

خودستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیورِ خرد سے معرّا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو اُن سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا

کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا
کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈبیہ میں میں نے پیا مال جب دکھا
پردے میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بے وقوف جتاتا ہے وہ سخا
کچھ اس لئے کہ ہم بھی انہیں میں سے ہوں شمار
اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اس لئے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور یہی
پرچاتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم بڑا
دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب کو
اور منہ سے دور کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا

کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حُسنِ ظن ہے یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

فارغ ہے وہ انھیں پہ ہوئے وصف جو بیان
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید عمرو ہے شدت سے سادہ لوح
گنتا ہے سب کو نیک وہ، اچھا ہو یا بُرا

کہتا ہے عُمر زید بھی کتنا ہے عیب بیں
بد ہو کہ نیک، اِس کی زباں سے نہیں بچا

یہ اس کا اور وہ اس کا بیاں کرکے کوئی عیب
ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا

غیبت، امید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خود ستا

حالی جو بیڑے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدّعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جس کو دیکھئے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بے چارہ مبتلا

جدید ترقیات

اے عزیزو میں بھی ہوں آخر بنی نوع بشر
غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمہیں بھی ہے خبر
کر رہا ہے خاک کا پُتلا وہ جوہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں
طائرِ وہم و تصوّر کے جہاں جلتے ہیں پر
اُس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و برّ و دشت و در
حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر
تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویم پارینہ وہ سب علم و ہُنر
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دم بہ دم یوں آج کل علم بشر
قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

سازو ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ در بہ در
کہتے ہیں مغرب سے ہوگا جب برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آرہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پُرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی!

اکبر الہ آبادی

حالاتِ زندگی : اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء میں الہ آباد کے نزدیک مشہور قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید تفضل حسین تھا جو اپنے زمانے کے مشہور صاحب علم اور حساب داں تھے۔ اکبر نے شروع میں اپنے والد سے ہی تعلیم حاصل کی۔ زمانہ کے دستور کے مطابق آپ کی شادی بچپن میں ہی ہوگئی جبکہ آپ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی اور بیوی کی عمر انیس سال کی تھی۔ مزاج موافق نہ ہونے پر آپ کو بیوی سے علیحدہ ہوجانا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ نے ایک نہایت حسین خوش رو اور خوش سلیقہ لڑکی فاطمہ صغریٰ سے شادی کرلی جو بعد میں اکبری بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ نئی بیوی کے گھر میں قدم رکھتے ہی عزت اور دولت برسنے لگی۔ پہلی شادی کے بعد سے آپ نے نوکری کی تلاش شروع کردی تھی۔ لیکن انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے تین چار سال تک اِدھر اُدھر دھکے کھاتے پھرے۔ آخر میں ۱۵ روپیہ ماہوار پر مزدور سے کام لینے کے لیے آپ کو نوکر رکھا گیا۔ اس دوران میں آپ نے انگریزی پڑھنا شروع کیا کچھ دنوں کے بعد آپ کے والد نے کسی سے سفارش کرکے آپ کو ریلوے میں ملازم کرا دیا اور تین چار سال تک وہاں کام کیا اس کے بعد وکالت پاس کی اور دو سال تک وکالت کرتے رہے۔ چونکہ آپ ہوشیار اور ذہین آدمی تھے اور اپنا کام نہایت عقلمندی اور دیانت داری سے کرتے تھے لہٰذا جلدی جلدی ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ الہ آباد کے سیشن جج

بنا دیئے گئے۔ ۱۹۰۳ء میں ریٹائر ہو کر پنشن لینے لگے۔ ۱۹۱۰ء میں حکومت نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ بیماری کے باعث آپ کی آخری زندگی بہت مصیبت میں گذری ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ مرنے سے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کوئی مرے تو دیکھ لو لے گیا وہ ساتھ کیا ؛ بیکار ہے یہ بحث کہ وہ چھوڑ گیا ہے کیا!

شعر و شاعری اکبر کو شعر کہنے کا شوق بچپن سے ہی تھا اور وحید میاں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جو آتش کے شاگرد تھے۔ اکبر کی شاعری کا رنگ بالکل الگ ہے جس میں ظرافت کے ساتھ طعن اور تشنیع کے نشتر بھی چھوڑے گئے ہیں۔ اور اس طنز سے آخر میں آپ نے جو اصلاحی کام کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ اکبر نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے مخصوص رنگ سے طنز کیے ہیں۔ آپ مذہب کے بہت پابند تھے۔ نماز روزہ شاید ہی کبھی چھوٹتا ہو۔ مغربی لباس کے بہت خلاف تھے۔ آپ ہمیشہ اُن تمام باتوں کے خلاف لڑتے رہے، جن کا تعلق بدمزاجی، تنگ نظری اور بدتمیزی سے ہے

اکبر کے لطائف :۔ اکبر سر تا پا ظرافت تھے۔ بات بات میں لطیفہ پیدا کرتے تھے۔ شعر گوئی کا یہ عالم تھا۔ کہ کسی نے بات کی۔ اور آپ نے فوراً شعر کہہ دیا۔ اکبر کے اگر تمام لطائف جمع کیے جائیں تو ایک کتاب بن جائے تاہم نیچے چند لطائف درج کیے جا رہے ہیں جن سے ان کی موزوں طبع اور شوخ مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) ایک مرتبہ ایک مسلمان گریجویٹ آپ کے پاس آئے جو تاریخ میں کافی جانکاری رکھتے تھے۔ آپ نے ان سے گفتگو کی اور بہت خوش ہوئے۔

تھوڑی دیر کے بعد مغرب کی اذان ہوئی۔ ان صاحب نے اجازت مانگی سب لوگ مصلے کی طرف بڑھے۔ اور وہ صاحب دروازے کی طرف ۔ یہ دیکھ کر اکبر نے فوراً یہ شعر پڑھا:

دل میں خاک اڑتی رہی خالی لبچہ و لب دیکھے
مذہب اب رخصت ہوا تاریخ مذہب ہی دیکھے

(۲) بیماری کا عالم تھا۔ ایک صاحب ایک بڑی ڈبل روٹی لے کر حاضر ہوئے آپ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے کہ "اتنی بڑی ڈبل روٹی ؟ یہ تو کسی یوروپین کا چوتڑ معلوم ہوتی ہے"۔ پھر کہا "خیر جانے دو" اور سب لوگ ہنس پڑے۔

خصوصیاتِ کلام

اکبر کی شاعری زبردست تاریخی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ اس عہد اور ماحول کی آئینہ دار ہے جو انگریزوں کے خلاف تھا۔ ان کی شاعری سے ہمیں اس تصادم کا پتہ چلتا ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان ہو رہا تھا۔ اکبر فطرتاً قدامت پسند تھے۔ وہ سرسید اور حالی کے اس نظریے کے خلاف تھے "جیسا دیس ہو ویسا بھیس رکھو"۔ اکبر کی شاعری نہ صرف اپنے زمانے کی عکاس ہے بلکہ زبردست انفرادی تنقید بھی ہے۔ اکبر اگرچہ تنگ نظر اور قدامت پسند تھے۔ مگر آپ کے دل میں ملک اور قوم کی سچی محبت اور تڑپ تھی۔ اکبر ترقی اور جدت پسندی کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کا دلی منشا یہ تھا کہ لوگ مغربی تہذیب کے غلام بن کر اپنے مذہب اپنے قومی احساسات و روایات اور اصولِ معاشرت کو نہ بھول جائیں۔ اکبر کا تخیل بلند، ذہن رسا اور طبیعت شوخ تھی۔ اکبر طنز کے بادشاہ تھے۔ اور اس فن کو معراجِ کمال تک

پہنچا دیا۔

اکبر الہ آبادی ایک اچھے انسان تھے اُن کی طبیعت پر مذہب اور تصوف کا رنگ غالب تھا۔

اکبر کے کلام میں شوخی، ظرافت اپنے عروج پر ہے اور اس طنز نے جہاں معاشی اصلاح کی ہے وہ ان کا منفرد لہجہ اور اسلوب ہے جو کسی شاعر کے بس کی بات نہیں۔

غرض اکبر ایک اچھے مزاح نگار۔
ایک اچھے طنز نگار۔
اور اچھے محبِ وطن۔
اور ایک بڑے انسان تھے۔

⁂ ⁂ ⁂

سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی

کشمکش

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبرؔ
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک
اُدھر ہے وحیٔ ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا

فرضی لطیفہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی
کُجا عاشق کُجا کالج کی بکواس

کُجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کُجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچہ نداس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھیری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفےٰ مرا باحسرت و یاس

دو تتریاں

دو تتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں
اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی، خوشرنگ، چُست، نازک، پیاری
پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پُھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا اُبھار
تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم
وہ بھی ہے بِلا زیادت و کم قائم

گو تابعِ جوشِ برق پردازی ہیں
دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں

کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے
اللہ اللہ کیا ہُنرمندی ہے

ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں
فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں

کس بزم میں ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں
پریاں اِندر کی جس سے شرمائی ہیں

ختمِ بہار

ختم کیا صبا نے رقص گل پہ نثار ہو چکی
جوشِ نشاط ہو چکا صوتِ ہزار ہو چکی
رنگِ بنفشہ مٹ گیا سنبلِ تر نہیں رہا
صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی
رُت وہ جو تھی بدل گئی آئی ہوا اور نکل گئی
تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی

اب تک اسی روش پہ ہے اکبرؔ مست و بے خبر
کہہ دے کوئی عزیزِ من فصلِ بہار ہو چکی

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ (پنجاب پاکستان) میں پیدا ہوئے لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ولایت (لندن وغیرہ) میں رہے۔ واپسی پر اپنی شاعری کے ذریعے ملک اور قوم کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ انگلستان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ واپسی پر لاہور میں وکالت شروع کی اور کامیاب بیرسٹر رہے۔ لیکن دل میں قوم کا درد اور تڑپ تھی۔ قوم کو بیدار کرنے اور ان کو عمل کی تلقین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

ابتدائی تعلیم آپ کی میر حسن صاحب سے ہوئی جو اردو فارسی میں جامع اُستاد مانے جاتے تھے۔ لڑکپن سے آپ کو شاعری سے رغبت تھی چنانچہ داغؔ سے جو اُس وقت حیدرآباد میں تھے بذریعہ خط و کتابت غزلیات میں اصلاح لیتے رہے۔ داغؔ تاڑ گئے کہ یہ ہونہار پنجابی طالب علم نیا شاعر ایک دن عظیم الشان شاعر اور رہنما ہوگا۔ اور ان کے کلام کو چار چاند لگا دے گا۔ کچھ دن اصلاح کے بعد مرزا داغؔ دہلوی نے اقبال کو لکھ دیا کہ: "تمہارے اشعار میں اصلاح کی ضرورت نہیں!"

اس طرح شاعری کی بے نظیر سند پاکر آپ لاہور کالج میں اعلیٰ تعلیم

حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہوئے۔ وہاں "آرنلڈ" سے کسب علم فلسفہ کیا اور ان کے ساتھ یورپ کا سفر کیا۔ وہاں کے قیام اور وہاں سے واپسی پر آپ کے خیالات میں انقلاب، ہلچل، جوش۔ درد غرض سب کچھ پیدا ہو گیا جس کا اظہار علامہ اقبال نے "شکوہ"۔ "خضر راہ"۔ "بانگ درا" "ضرب کلیم" اور "بال جبریل" میں اس خوبی سے کیا کہ دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

اقبال کی دماغی حالت اور قابلیت اساتذہ کو جلد گرویدہ کر لیا کرتی تھی۔ آپ کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ پوری غزل رات کو سوچ لیا کرتے تھے اور صبح اس کو لفظ بہ لفظ لکھوا دیا کرتے تھے۔ کسی شاعر یا کتاب کی ایک مرتبہ پڑھی ہوئی نثر و نظم دماغ پر پتھر کی لکیر بن جاتی تھی۔ لوگ قلم دوات لے کر بیٹھتے اور آپ اشعار اس طرح لکھواتے جاتے جیسے کوئی قصہ لکھوا رہے ہوں۔ اور کمال یہ کہ بہ لحاظ شاعری کلام میں تخیل، سلاست، روانی ایسی کہ ایک شعر دوسرے شعر سے بڑھ چڑھ کر ہوتا تھا۔ گویا اشعار زر خرید غلاموں کی طرح ہر وقت آپ کی خدمت میں موجود رہا کرتے تھے اور آپ کے اشاروں پر جیسے رقص کناں ہوں۔

علامہ اقبال کی شاعری کے تین دور ہیں۔

پہلا دور: ۱۹۰۵ء سے پہلے تک ہندوستان میں آپکی شاعری ۱۹۰۱ء میں لاہور کے مشاعرے میں "ہمالیہ" کی نظم سے شروع ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ کی آواز گونج گئی اور عوام سے داد و تحسین حاصل کرتی رہی۔

دوسرا دور: ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ یورپ کے قیام کے

کے دوران آپ کی شاعری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ آپ کی فارسی نظم "اسرارِ خودی" کا ترجمہ آپ کے قابل استاد "آرنلڈ" نے کر کے یورپ والوں کو ہندوستانیوں کے اعلیٰ تخیل سے متعارف کرایا اور اُن کو حیرت میں ڈال دیا۔ جسکی بنا پر کیمبرج یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ایران بلکہ تمام فارسی داں طبقہ نے آپکی بہت تعریف، قدر و منزلت اور عزت افزائی کی۔

اُس زمانے میں آپ نے یورپ کی سیاست اور اندرونی کیریکٹر کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ وطنیت اور قومیت کا تخیل محض ایک دھوکا ہے۔ اسی کے نام پر دنیا کے ممالک آپس میں لڑ رہے ہیں اور اس کا نتیجہ مغربی تہذیب ہے جو غیر مساوی حقوق اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے طریقے پر چل رہی ہے۔

اقبالؔ اس دھوکے کی وطنیت اور قومیت سے بیزار ہو گئے۔ اور دنیا کو اسلامی اخوت۔ اسلامی رواداری، خودی اور جذبۂ عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اکثر اشخاص اقبالؔ پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن خود اقبال کے نزدیک اسلام کا تصوّر انسانیت کا اعلیٰ ترین تصوّر ہے۔ اور ان کا مردِ مومن دنیا کا اعلیٰ ترین انسان ہے۔ اقبالؔ پر یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔

تیسرا دور: اقبالؔ کی شاعری کا تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر آخری وقت تک ہے۔ یہ دورِ حاضرہ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ وہ ایک فلسفی، مفکر اور حکیم کی حیثیت سے زندگی کے گوناگوں مسائل پر اور خود زندگی پر تحسین اور تنقید کی نظر ڈالتے ہیں اور خامیوں کو بغیر کسی خوف کے کھلے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اس دور میں تخیل، تجربہ

معلومات الغرض ہر چیز پختہ ہو گئی تھی۔

خصوصیات کلام

اقبالؔ نے بڑے بڑے فلسفیوں اور شاعروں سے فائدہ اٹھایا لیکن تقلید کسی کی نہیں کی۔

نکھری ہوئی زبان، سلیس انداز کلام اور شگفتہ و رنگین تراکیب آپکے کلام کے خاص محاسن ہیں۔ نظمیں آپ کی افسانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقبالؒ نے بانگِ درا کی اشاعت کے بعد دس پندرہ سال تک اردو میں کچھ نہ کہا بلکہ فارسی پر زور رہا۔ مثلاً اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، جاوید نامہ، زبورِ عجم، مسافر، وغیرہ فارسی کے لازوال مرقعے ہیں۔

اقبالؔ: حالؔی اور اکبرؔ کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ ان کے اردو کلام کے تین مجموعے ہیں:۔

(۱) بانگِ درا۔ (۲) بالِ جبریل (۳) ضربِ کلیم۔

ارمغانِ حجاز بھی آپ کے اردو کلام کا ایک حصّہ ہے۔ ان مجموعوں میں غزلیں قطعات۔ مثنویات۔ رباعیات اور مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ آپ کی غزلوں میں دورِ جدید کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور نئی شان کے ساتھ۔ ان میں تاثیر۔ روانی، رنگینی، شگفتگی، درد اثر کے ساتھ فلسفیانہ بلند آہنگی سب کچھ بدرجہ کمال موجود ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

عملیل تپہار

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سُنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لَے سُنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں ! — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آ کے چمکا، گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟ — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
حُسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی — لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی — پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو — گل کو زباں دے کر تعلیمِ خامشی دی

نظّارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی | چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت | پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو | پانی کو دی روانی، موجوں کو بیکلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے | انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا | واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ | نغمہ ہے بوئے بلبل، بُو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی | جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سرین کا
نہاں ہوا جو رُخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوار توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا
عجیب مے کدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گُل میں گُہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اُٹھے
ہوا کے زور سے اُبھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل
عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

دُرگا سہائے سرُورؔ جہان آبادی

مُرغابی

ڈھل گیا دن اور شبنم ہے زمیں پر قطرہ ریز
گوشۂ مغرب میں گلگوں ہے شفق سے آسماں
پڑ رہی ہیں دُور تک سورج کی کرنیں زرد زرد
جا رہی ہے تو اکیلی شام کو اُڑتی کہاں؟
دیکھتا کیوں ہے عبث صیاد سوئے آسماں
پاس کی نظروں سے تیری شوکتِ پرواز کو
ارغواں رازِ فلک کے منظرِ خوش رنگ نے
کر دیا ہے اور دل کش تیرے نقشِ ناز کو
ڈھونڈتی پھرتی ہے کیا کوئی سہانا آبشار
یا کہ سرگرمِ تلاشِ دامنِ دریا ہے تو؟
کیا کسی بحرِ تموّج خیز کی ہے جستجو
یاں سکوتِ شام میں کیوں آسماں پیما ہے تو؟
تو جو بے سنگِ نشانِ جادہ و بے مرحلہ
کر رہی ہے آسماں پر قطع طبقاتِ ہوا

اُڑ سکے بے پدرقہ تو یہ کہاں تیری مجال
کوئی طاقت ہے مگر تیری مقرر رہنما
اے سبک پرواز تیری سرعتِ پرواز نے
طے کئے کتنے ہی دن پھر سردِ طبقاتِ نسیم
ہو کے درماندہ زمیں پر گرنہ شہ پر چھوڑ کر
شب کی ظلمت کا ہے گرچہ سر پہ طوفانِ عظیم
ہو چکی تیری مشقّت ختم تجھ کو عنقریب
گرمیوں کا اک سُہانا گھر ملے گا خوش گوار
گاتی ہوگی چھوٹی چڑیوں میں ہم آہنگی سے تو
اور نشیمن پر ترے ہوگی نیستاں کی بہار
ہوگئی غائب فضائے آسماں میں گرچہ تو
اور اب آنکھوں میں ہے تیرا تصوّر یادگار
میں نے سیکھا ہے سبق لیکن تری پرواز سے
ہے طریقِ زندگی میں تو مری آموزگار
منطقہ سے منطقہ تک اے سبک پروازِ شوق
دقّتِ اوجِ فلک پر ہے جو تیرا راہبر
مجھ کو بھی لے جائے گا وہ منزلِ مقصود تک
جب کروں گا جادۂ ہستی کا میں تنہا سفر

بچپن کی یاد

تیرے ایاغ کا ہوں میں جرعہ خوار بچپن ۔۔۔ باقی ہے تیری مے کا اب تک خمار بچپن
تیرے فراق میں ہوں میں بیقرار بچپن ۔۔۔ کرلوں گلے لگا کر آ! تجھ کو پیار بچپن

کیوں مجھ سے روٹھ بیٹھا تیرے نثار بچپن

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں میں بناؤں ۔۔۔ چھوٹی سی اپنی کشتی پانی میں پھر بہاؤں
طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گاؤں ۔۔۔ پھر بانسری بجاؤں، پھر جھنجھنا بجاؤں

دو دن کو اے جوانی دیدے ادھار بچپن

وہ عہدِ بے خودی بھی پروردگار کیا تھا ۔۔۔ حسرت کی جب نظر سے ہر شے کو دیکھتا تھا
نیچر کا جو نظارہ، تھا آرزو فزا تھا ۔۔۔ قوسِ قزح کے پیچھے میں دن کو دوڑتا تھا

ہر قمر تھا شب کو میں اشکبار بچپن

تو آئے ہائے طفلی جا کر کہاں یہ ممکن ۔۔۔ اور میرے ساتھ کھیلیں میرے رفیقِ کم سن
تیرا خیال پھر بھی تسکین فزا ہے لیکن ۔۔۔ گلیوں میں دوڑنا تھا کس لطف کے تھے وہ دن

گھوڑے پہ اپنے ہو کر جب میں سوار بچپن

تونے کئے جوانی طفلی کے کیا کھلونے ۔۔۔ وہ میرے ننھے ننھے تسکین فزا کھلونے
میں جن سے کھیلتا تھا وہ دلربا کھلونے ۔۔۔ لادے کہیں سے مجھ کو وہ خوشنما کھلونے

ان پیاری مورتوں کو ہوں بیقرار بچپن

پیارا تھا باپ کا میں اور ماں کا لاڈلا تھا ۔۔۔ گھر بھر میں پھول گویا میں اک گلاب کا تھا

صورت بھی دلربا تھی چہرہ بھی خوشنما تھا	یہ ننھے ننھے تلوے، وہ ابھرا ابھرا ماتھا
بھولے نہیں وہ تیرے نقش و نگار بچپن

منت کی وہ گلے میں چھوٹی سی آہ ہیکل	کانوں میں ہلکے ہلکے وہ موتیوں کے کنڈل
وہ لمبے لمبے گیسو لٹکے ہوئے مسلسل	وہ سُرخ سرخ غازہ بہتا ہوا وہ کاجل
وہ ہائے تیرا جوبن اور وہ سنگھار بچپن

کیچڑ میں وہ پھسل کر گلیوں میں لیٹ جانا	اور میرے ہم سِنوں کا وہ قہقہے لگانا
شانہ پکڑ کے میرا آہستہ پھر اٹھانا	لت پت وہ گھر کو آنا وہ ماں کا مسکرانا
کرتا نیا بدل کر کرنا وہ پیار بچپن

آ، عمرِ رفتہ آکر مجھ کو گلے لگالے	آ اے شباب میری طفلی کے ناز اُٹھالے
عمرِ رواں نے تجھ کو کس کے کیا حوالے	پایا نشان نہ تیرا او چھپ کے جانیوالے
کھویا گیا کہاں تو؟ تیرے نثار بچپن

کوئل کی آہ ' کوکو' وقتِ سحر وہی ہے	نالوں میں بلبلوں کے اب بھی اثر وہی ہے
تیرا بھی او پپیہے! سوزِ جگر وہی ہے	سورج وہی ہے، دن کو شب کو قمر وہی ہے
تیرے مگر کہاں وہ لیل و نہار بچپن

تو نے چرالیا ہے بچپن مرا جوانی	تیری طرف سے ظالم ہے مجھ کو بدگمانی
اک تیرے دم سے طفلی! تھا لطفِ زندگانی	میں غم زدہ سناؤں غم کی کسے کہانی
تو ہی نہیں رہا جب او غمگسار بچپن!

داغوں سے میں سجاتا چھوٹی سی تیری خلوت	نالوں کو ساتھ لیکر کرتا طوافِ تربت
مجھ غم زدہ کی لیکن ایسی کہاں تھی قسمت	چلتا جو میرا قابو تو آہ وقتِ رحلت

پہلو میں میں بنا تا تیرا مزار بچپن

دایہ کی دوش، ماں کی آغوش سے جدا ہوں
سڑکوں پہ خاک اڑانا گلیوں میں لوٹتا ہوں

طفلی کی آرزو و! تم سے بچھڑ گیا ہوں
ان پیاری لوریوں کو کب سے ترس گیا ہوں

لے لے شباب، دے دے پروردگار بچپن

پنڈت برج نرائن چکبست

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں کے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبرؔ نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ جسموں کی افسردگی مٹا دے

اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھادے
حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہوکر
سر میں خمار ہوکر دل میں سرور ہوکر

رامائن کا ایک سین

راجہ رام چندر جی کا ماں سے رخصت ہونا

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں تھی گم وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھُلا
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھُلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھُلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھُلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں!
دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ اَبَد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے
لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو
کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال

چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بے کس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دُور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
ہوتا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سربسر
اسبابِ ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار۔۔۔

سختی سبھی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ درون سے قلب و جگر ہو گئے کباب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
قایم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑکر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم اُمید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

اور یوں کسی کو رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جان کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بےشمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندہ کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

مجازؔ

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں ترقی پسند طلبار کا ایک خاص زور تھا جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا مگر ادب کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ان نوجوان ادیبوں اور شعرار میں مجازؔ کی کافی اہمیت ہے۔ یونیورسٹی سے بی اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اور پھر کچھ دنوں حکومت بمبئی کے محکمۂ اطلاعات میں ملازم رہے۔ پھر حلقۂ ادب لکھنؤ کے سرگرم کارکنوں اور "نیا ادب" کے ادارہ میں رہنے کے بعد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ملازم ہو گئے۔

آج کل دنیا میں رہ کر کون حساس شخص یا ادیب ہو سکتا ہے جو اپنے ماحول سے متاثر نہ ہو ملک کی بڑھتی ہوئی متوسط طبقہ کی ابتری بیروزگاری کا بھوت جو تعلیم یافتہ نوجوان کو ڈرا رہا ہے۔ روزمرّہ کی جنگ اور خون بہانا اور اسی طرح پر سینکڑوں ایسی چیزیں ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور انسانیت کا جذبہ ہمیں اس نظام کے بدل دینے کے لیے دعوتِ عمل دیتا ہے۔ ایک حقیقت نگار شاعر کا دل ان چیزوں کا اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجازؔ بھی اس ہیبت ناک سماج کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اور دعوتِ انقلاب دیتے ہیں۔ وہ بیداری کا پیغام سناتے ہیں۔ اور ہمیں اس فرسودہ نظام کے خلاف جنگ کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔

مگر اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے گذر کر مجازؔ نے محسوس کیا کہ شاعری کا مقصد فلسفیانہ نظمیں لکھنا ہی نہیں ہے۔ ایک فنکار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے حالات کا مطالعہ کرے اُسے سمجھنے کی کوشش کرے اور ان باتوں کے اثرات جو جذبات کو برانگیختہ کر دیتے ہیں۔ انھیں ایک پیکرِ لطیف میں سامعین کے سامنے پیش کرے۔ مجازؔ نے ڈرائینگ روم میں شعر کہنا شروع کیا وہاں سے اُٹھ کر ٹینگ میں نغمہ سرا ہوئے۔ پھر فن کی دنیا میں داخل ہو کر اپنے جذبات کو اس طرح بیان کیا کہ ان میں ہمہ گیری آ گئی۔

یہ کہنا تو غلط نہ ہوگا کہ مجازؔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے لیکن کچھ پختگی آ جانے کے بعد بہت ممکن ہے ان کی شاعری سمجھی جائے۔ مجازؔ کی شاعری کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ ان کے کلام کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عروسِ سخن نے بھی اب عوام کے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے تہذیب و تمدن کی دلہن کا لباس اب ریشمی نہیں۔ وہ چیتھڑے پہنے ہوئے ہے وہ قصر امرار کے آرام اور غلامی سے پیچھا چھڑا کر سیلاب حیات کے منجدھار میں پڑنا زیادہ پسند کرے گی۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اردو شاعری میں یہ رجحان ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ لیکن مجازؔ کے یہاں جن خوبیوں کے ساتھ اس قسم کی شاعری آئی۔ وہ ان کو ایک امتیازی پہلو عطا کر گئی۔

مجازؔ کی شاعری میں جذبات نگاری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے انھوں نے نوجوان طبقہ کے جذبات، غریبوں کے حالات اور بیروزگار انسانوں کے جذبات وغیرہ کو نہایت سچائی اور لطف کے ساتھ بیان کیا۔

مفلسی کے ہیبتناک مناظر یا سرمایہ داری کے ظلم کا نقشہ کھینچتے ہوئے بھی شعریت کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ ان کے کلام میں روانی گھلاوٹ اور شیرینی بہت ہے۔

ان کی رومانی نظموں میں ایک خاص زندہ دلی ہے۔ ایک چھلکتی ہوئی نمود ہے۔ ناامیدی اپنے کو فنا کرنے کا جذبہ اور قنوطیت کے عناصر ان میں بہت کم ہیں۔ جوانی کی سرمستی اور اُمنگیں ان کے کلام کو ایک خاص دلکشی بخشتی ہیں۔

مجازؔ کے کلام کا مجموعہ ۱۹۲۸ء میں "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ ان کی کئی نظمیں مثلاً رات اور ریل "آوارہ"، "اندھیری رات کا مسافر"، وغیرہ اردو داں نوجوان جماعت کی زبان پر ملیں گی۔ ۱۹۴۵ء میں اپنے پُرانے مجموعے 'آہنگ' میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے اُسے "شبِ تاب" کے نام سے شائع کیا۔ اور اسی طرح ایک مجموعہ اور نکالا جس کا نام 'سازِ نو' رکھا۔

مجازؔ کا انتقال ۱۹۵۵ء میں بمقام لکھنؤ ہوا۔



اسرار الحق مجاز

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنّم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لَے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگھروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کرکے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بدم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
یاد آجائے پرانے دیوتاؤں کا جلال!
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی

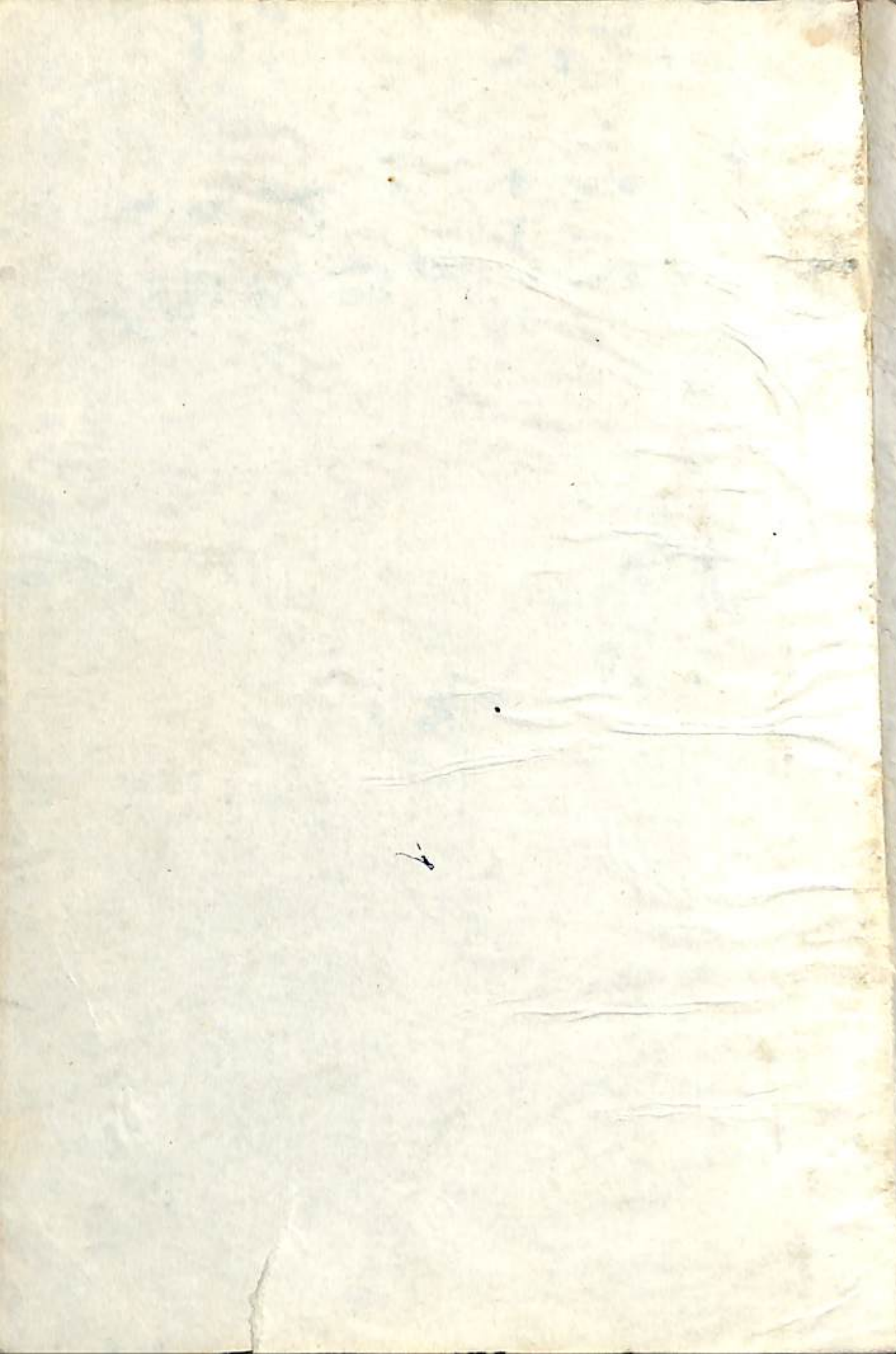
اک پہاڑی پر دکھائی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دُھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں مُنہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پُل پہ دریا کے دمادم کوندتی، للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندّی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
مُنہ میں گھستی ہے سُرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھرّاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حِس چٹانوں پر حقارت سے نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامنِ تاریکیِ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت عَلَم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ دَرّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی دُہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی

الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف وخطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی



PARVEEN



گیارہویں جماعت کے
طلباء کے لئے
مفید اردو کتاب

کپور مکمل اردو گائیڈ

مصنف
ایس ایل گومر ایم اے، گولڈ میڈلسٹ
جس میں
کورس کی تمام کتابوں کے نوٹس، اچھوتے انداز سے لکھے گئے ہیں